# شہریارِ دکن

محمد عبدالہادی صدیقی۔ ایم۔ اے

زیر اہتمام

رائٹرز بیورو کراچی

فون ۲۳۸۷۳۴

۲۰۔ ہیمانی مینشن۔ روبرو کے۔ ایم۔ سی بندر روڈ کراچی۔

| | |
|---|---|
| ناشر | عزیز الرحمٰن |
| اشاعت | فروری ۱۹۶۸ء |
| تعداد | ۱۰۰۰ ایک ہزار |
| مصور | س. محمود الحسین |
| کتابت | دلشاد عالم خاں |
| مطبع | انجمن پریس کراچی |
| قیمت | پانچ تین روپے |

# اِنتسابُ

نواب محسن خاں

کے نام

گر قبول اُفتد زہے عِزّ و شرف



سلطان العلوم اعلیٰحضرت بندگانعالی ہز اکزالٹیڈ ہائینس
نواب میر عثمان علی خاں آصفِ سابع شہر یارِ دکن و برار

# نذرِ دکن

## عزیز اقبال

سب اہلِ درد گئے ، رشکِ انجمن چھوٹا
وفا کا ذکر، محبت کا جب چلن چھوٹا

چمن میں کب سے ہوں میں مثلِ بوے آوارہ
یہی کہ سلسلۂ ربطِ جان و تن چھوٹا

مِلا نہ سایۂ دیوار بھی ہمیں اب تک
یہ اور بات کہ تیرے لئے وطن چھوٹا

قفس سجا ہے جفائے کرم۔ ندامت پوچھ
کسی نے نوچ لئے بال و پر، چمن چھوٹا

کرے تو کون کرے جادۂ سخن کی تلاش
اداشناس اٹھے، اہتمامِ فن چھوٹا

وہ اک بہانۂ تسکینِ اضطراب سہی
کہیں کے ہم نہ رہے ہم سے جب دکن چھوٹا

# سخن ہائے گفتنی

بہادر شاہ ظفر کے ساتھ ہی شمالی ہند میں جب مغلیہ سلطنت کے جاہ وجلال، تہذیب وتمدّن ، شوکت وحشمت کا چراغ گل ہوگیا تو آصفجاہ اوّل نے اس چراغ کو دکن میں دوبارہ روشن کیا جس نے آصفجاہی سلطنت کی صورت ڈھائی سو برس تک مغل تہذیب اور اسلامی روایات کو زندہ رکھا۔

دودمانِ آصفی کے آخری چشم وچراغ اعلیٰحضرت میر عثمان علی خاں کے دور میں دکن تہذیب وتمدّن اور علم وفن کا سرچشمہ بن گیا۔ اعلیٰحضرت اسلامی اقتدار کے مظہر تھے۔ ان کا پرچم آصفجاہی پرچم نہیں بلکہ اسلامی ثقافت کا پرچم تھا جس کے سائے میں تمدن، تہذیب، ثقافت، معاشرت اور علم وفن پروان چڑھے۔

علامہ اقبال نے اعلیٰحضرت کو یوں خراجِ عقیدت پیش کیا کہ

؎ از تو باقی سطوتِ دینِ مبیں۔

مولانا ظفر علی خاں نے فرمایا

؎ کہ تو ہے ہند میں ملّت کا افتخار ابھی

فصاحت جنگ جلیل کے الفاظ میں

؎ چراغِ ملّتِ بیضا انہیں سے جلتا ہے۔

فانیؔ بدایونی کی زبان میں

؎ علم کی زینت، ادب کی قدر و قیمت تجھ سے ہے۔

مولوی سیّد ہاشمی فرید آبادی

؎ طُرّہ علم کا تم نے سجایا تاجِ شاہی پر۔

حضور نظام کی اکاسی سالہ زندگی پر نظر ڈالی جائے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ مسلمان پہلے تھے اور بادشاہ بعد میں۔ بہ حیثیت مسلمان کے انھوں نے اسلامی اقدار کو زندہ رکھا اور بحیثیت بادشاہ کے انہوں نے اپنی رعایا کی فلاح و بہبود کے لئے وہ سب کچھ کیا جو ان کے بس میں تھا۔ علوم و فنون کو ان کی ذات سے جو فیض پہنچا اس کو تاریخ سنہری الفاظ میں لکھے گی۔ بادشاہت میں قلندری کی جو مثال انہوں نے قائم کی اس کا زمانہ شاہد ہے۔ ان کا فیض نہ صرف دکن میں بلکہ بیرونِ دکن بھی عام تھا۔

سالِ گزشتہ ان کی وفات کی خبر بجلی بن کر گری۔ علماء، فقہا، ادیب، شاعر، سیاست داں غرضکہ ہر مکتبِ خیال اور اہلِ ظرف نے انکی خدمات کو سراہا۔ اور ان کی زندگی کے روشن گوشوں کو بے نقاب کیا تو ہمیں حضور نظام کی شخصیت میں وہ حسن نظر آیا جو ہماری تاریخ کا بیش بہا ورثہ ہے۔

ضرورت اس امر کی تھی کہ ان منور گوشوں سے سب ہی کو روشناس کروایا جائے تاکہ ایک عظیم شخصیت کی عظیم صفات اور کارنامے قلب و ذہن

کی گہرائیوں میں محفوظ ہو جائیں۔ اس سے بہتر اس پیکر عظمت کو اور کیا نذرانۂ عقیدت پیش کیا جا سکتا ہے جس نے نہ صرف موجودہ بلکہ آنے والی نسلوں پر بھی احسان کیا ہے۔

ناسپاس گزاری ہوگی اگر ان پیکرانِ خلوص و محبت کا شکریہ ادا نہ کروں جن کی مساعی کے باعث اس کتاب کی اشاعت ممکن ہو سکی خصوصاً جوان فکر و جواں سال شاعر عزیز اقبال صاحب اور عزیز الرحمٰن صاحب کے جذبۂ خلوص و خدمت نے اس عظیم کام کو ممکن بنایا

زیرِ نظر کتاب کے محرک عزیز اقبال صاحب (رائٹرز بیورو) ہیں جنکے پیشِ نظر مطبوعات کا ایک جامع منصوبہ ہے

فروری ۱۹۶۸ء        محمد عبدالہادی صدیقی

کلامِ فصاحت التیام اعلیٰحضرت سلطان العلوم خسروِ دکن

# قومی ترانہ فارسی

الٰہی تا جہاں باشد شہنشاہِ جہاں باشی
خدایت مہربان و تو بہ عالم مہرباں باشی

نفس تا بر ہمی آرم دعا کردن بود کارم
ہمیں وردِ زبان دارم کہ دائم حکمراں باشی

کند تا زمزمہ بلبل، خورد تا پیچ و خم سنبل
زند تا خندۂ خوش گل، بہارِ بوستاں باشی

دمد تا سبزہ و ریحاں بود تا سرو در بستاں
بباغِ دہر اے سلطان بہارِ بےخزاں باشی

نظام الملک عثمان علی خاں آصفِ سابع
سراجِ دینِ اسلامی امیرِ مومناں باشی

٭

# قومی ترانہ اردو

تا ابد خالقِ عالم یہ ریاست رکھے
تجھکو عثماں بصد اجلال سلامت رکھے

جیسے تو فخرِ سلاطین ہے بفضلِ یزداں
یوں ہی ممتاز ترا دورِ حکومت رکھے

آل و اولاد کو اللہ دے عمرِ خضرؑ
اُن سے آباد ترا خانۂ دولت رکھے

جُودِ حاتم رہے شرمندۂ احسان ترا
عدلِ کسریٰ کو خجل تیری عدالت رکھے

خندہ زن صورتِ گل ترے ہوا خواہیں
آ کے قدموں پہ عدو فرقِ اطاعت رکھے

بن کے ساقی ترا اقبال نظام سابع
تجھ کو صہبا کشِ خمخانۂ عشرت رکھے

# قطعہ

## اعلیحضرت میر عثمان علی خاں عثمانؔ

مذہبے ہست ایں نہ جائے لاف بوُد
مثلِ آئینہ کہ بس شفاف بوُد
نازم اے عثمانؔ برایں تفضیلِ خویش
آباؤ اجدادم ہمہ احناف بوُد

# دیگر

نسبِ من بوُد کہ صدیقی رضؓ
سلسلہ باشد از سہروردیؒ
ہست در اسم ِمن علی عثمانؔ
طُرہ شد بر کلاہِ زردوزی

---

# از تو باقی سطوتِ دینِ مبیں

از

ڈاکٹر سر محمد اقبالؒ

اے مقامت برتر از چرخِ بریں
از تو باقی سطوتِ دینِ مبیں

جلوہ صدیقؓ از سیمائے تو
حافظِ ما تیغِ جوشن فائے تو

از تو مارا صبحِ خنداں شامِ ہند
استعانت مرکزِ اسلامِ ہند

دوشِ زندہ از امروزِ تو
تابِ ایں برقِ کہن از سوزِ تو

بندگاں ہستیم ما، تو خواجۂ
از پئے فردائے ما دیباچۂ

پیشِ سلطاں ایں گہر آوردہ ام
قطرۂ خونِ جگر آوردہ ام

# کہ تو ہے ہند میں ملّت کا افتخار ابھی

## از مولانا ظفر علی خاں

ڈھلا نہیں ہے گُل و لالہ کا غبار ابھی : برس کچھ اور بھی اے ابرِ نو بہار ابھی
بدل چکا ہے بدلتا ہے اور بدلے گا : بہت سے رنگ یہ چرخِ ستیزہ کار ابھی
بہار سر پہ ہے اے پنجۂ جنوں پھر کیوں : کیا نہ تو نے گریباں کو تار تار ابھی
نہیں کرشمہ ساقی کی اس میں کچھ تقصیر : کچھ اہلِ بزم جو بیٹھے ہیں ہوشیار ابھی
زمانہ جس کی تجلّی سے جگمگا اٹھا : ہے جلوہ ریز وہ خورشید زرنگار ابھی
محمدؐ عربی کے جلال کا پرتوَ : ہے شکلِ غازیٔ اعظم سے آشکار ابھی
خدا بھی زندہ ہے اس کا کلام بھی زندہ : اساسِ سطوتِ کبریٰ ہے استوار ابھی
حیاتِ دہر شہادت کیساتھ ملتی ہے : فنا کی رمز بقا کی ہے. رازدار ابھی
دکن کے باغ میں چھائی ہوئی تھی خاموشی : سنا ہے میں نے مگر نغمۂ ہزار ابھی
یہ کہہ رہی ہے پلٹ کر نگاہِ یار ابھی : زمانہ اور بھی بدلے گا ایک بار ابھی

خدا کا سایہ ترے سر پہ آصفِ ہفتم
کہ تو ہے ہند میں ملت کا افتخار ابھی

# تو سلامت رہ کہ آن اپنی سلامت تجھ سے ہے

از شوکت علی خاں فانی بدایونی

شاہِ عثماں آصفِ سابع امیر المومنین
سچ تو یہ ہے آبروئے ملک و ملت تجھ سے ہے

تو ہے سلطان المعانی تو ہے سلطان العلوم
علم کی زینت ادب کی قدر و قیمت تجھ سے ہے

غیرتِ بغداد و رشکِ قرطبہ ہے آج کل
وہ دکن سارے جہاں میں جسکی شہرت تجھ سے ہے

تیرے دم سے آج بھی روشن ہے حکمت کا چراغ
آج بھی آباد بزمِ اہلِ ہمت تجھ سے ہے

حیف ان پر جو ترے دامن سے وابستہ نہیں
وہ مبارک قسمتیں ہیں جن کو نسبت تجھ سے ہے

کس کے دل میں درد ہے اربابِ علم و فضل کا
ملک میں اہلِ ہنر کی آج عزت تجھ سے ہے

جو ہوا چاہتی تھی کلِ حوادث کا شکار
اس زباں میں اب زباں بننے کی قدرت تجھ سے ہے

تو سراپا فیض ہے عالم ہے دلدادہ تیرا
ایک فانی کیا زمانے کو عقیدت تجھ سے ہے

ہو تیرا حامی خدا، حامی ہے تو مخلوق کا
تو سلامت رہ کہ آن اپنی سلامت تجھ سے ہے

# مایۂ نازِ جہاں آج ہے شاہی تیری

ازنواب فصاحت جنگ بہادر جلیلؔ مانک پوری، استادِ حضور پر نور ہند گانعالی

مایۂ نازِ ہے جہاں آج ہے شاہی تیری
واہ کیا شان ہے اے ظلِ الٰہی تیری

ہے حیاتِ ابدی سارے زمانہ کے لئے
اک نگاہِ کرمِ نامتناہی تیری

کیوں نہ حصے میں ترے فتح کا میداں ہے
کہ مدد کرتی ہے تائیدِ الٰہی تیری

کیوں مسلّم نہ ہو شاہوں میں تری یکتائی
بخت و اقبال بھی دیتے ہیں گواہی تیری

حکمرانی کا یہ انداز کسے آتا ہے
کشورِ دل میں بھی اے شاہ ہے شاہی تیری

یہ بھی سرکار کے قدموں کا تصدق ہے جلیلؔ
خوش نصیبی نے رفاقت جو نباہی تیری

ولہٗ

انہیں سے باغِ جہاں پھولتا ہے پھلتا ہے
انہیں کے نقشِ قدم پر زمانہ چلتا ہے

یہی ہیں حامئِ دیں ظلِّ حق شہ عثمان
چراغِ ملتِ بیضا انہیں سے جلتا ہے

# سُلطان العلوم

از مولوی سیّد ہاشمی صاحب فرید آبادی

---

ندائے دہر نے یہ راز افشا کر دیا آخر
کہ بے جا ناز تھا دارا و جم کا کج کلاہی پر
جنہوں نے ملک و دولت پر بنا رکھی تھی عظمت کی
زمانہ مضحکہ کرتا تھا ان کی کم نگاہی پر
ہوا کیا گر کسی نے قصرِ عالی کی بنا ڈالی
رقم ہے کہنگی پر سقفِ گنبد کی سیاہی پر
مگر شاہا مبارک ہو یہ فخرِ جاوداں تم کو
کہ طرّہ علم کا تم نے سجایا تاجِ شاہی پر

ؔ

# فہرست

# غریب و سادہ و رنگین ہے داستانِ حرم

حیدرآباد دکن ـــــ اس نام کے ساتھ ہی کتنی ہی یادوں کے چراغ جل اٹھتے ہیں.

رودِ موسیٰ کے کنارے بے شمار قافلوں نے پڑاؤ ڈالا۔ یہ سرزمین ایسے قافلوں کی رہ گذر بھی بنی جن کی بانگِ درا آج بھی فردوسِ گوش ہے. اِن قافلوں میں سلاطین، قلندر، اولیاء و بزرگانِ دین، دانشور، علماء و فقہاء، مفکرین و مصلحین، اہلِ علم، اہلِ قلم، اہلِ فن اور اہلِ کمال شامل تھے۔

نہ جانے ان قافلوں کی منزل کونسی تھی لیکن رودِ موسیٰ کی لہروں کے بانکپن نے انھیں ایسا دالہ و شیدا بنالیا کہ انہوں نے اسی کے کناروں کو اپنی منزل بنالیا۔ یہاں کے کوہ و دمن، سبز پوش وادیاں، مہکتے اور دہکتے ہوئے مرغزار، بل کھاتی ہوئی پگڈنڈیاں سرسبز و شاداب کھیت ـــ اس سرزمین کی جانے کونسی ادا تھی جو انہیں بھا گئی۔ جو یہاں آیا یہیں کا ہو کر رہا ـــ اس سرزمین کی خاک میں وہ سحر اور وہ اعجاز تھا کہ جس نے مسِ خام کو کندن بنادیا، ذروں کو ہمدوشِ ثریا اور آفتاب کا ہمسر بنادیا۔

دکن کے ساتھ رزم و بزم، علم و فن، حکمت و دانش، سیاست و قیادت تہذیب و تمدن اور ثقافت و روایات کی ایک داستان وابستہ ہے. یہاں کے

اُفق پر ایسے درخشاں ستارے بھی نمودار ہوئے جو مثلہ کامل بن گئے۔ دکن نے علم وفن کی وہ مشعل روشن کی جس کی روشنی میں بھولے بھٹکے قافلوں نے منزل پائی سرزمین دکن پر اسلامی روایات، شان وشوکت، عظمت وسطوت کی یادگاریں ملتی ہیں۔

---

آرہی ہے یہ صدا کان میں ویرانوں سے
کل کی ہے بات کہ آباد تھے دیوانوں سے

گولکنڈہ ـــ لعل وگہر، زمرد، پکھراج اور نیلم ویاقوت کی سرزمین اپنے اندر تاریخ کے کتنے ہی افسانوں کو چھپائے ہوئے ہے۔ گولکنڈے کے کھنڈر نہ صرف شاہوں کے جاہ وجلال کے لازوال نقوش ہیں بلکہ سلاطین کی رزم آرائیوں کی منہ بولتی تصویر اور قطب شاہی سلاطین کی بزم آرائیوں کے چشم دید گواہ بھی ہیں۔ ان ویرانوں میں پہلے صاحبِ دیوان شاعر "قلی قطب شاہ" کے ملوک الکلام کی بازگشت ابھی سنائی دیتی ہے، بھیگی ہوئی چاندنی راتوں میں ملا وجہی کی "سب رس" کانوں میں رس گھولنے لگتی ہے، "قطب مشتری" کی داستان حسن وعشق کی رنگینیاں بکھیرتی ہے۔ ولی کا تغزل وتصوف دلوں کو آج بھی گرما رہا ہے۔

قلی قطب شاہ ملا وجہی اور ولی اس تصور سے بے نیاز تھے کہ ایک ایسا دور بھی آئے گا کہ ان کے نام اور کلام کی بازگشت برصغیر ہند وپاک کے دانشکدوں

میں سنائی دے گی۔

قطب شاہی خاندان کے دیگر بادشاہوں نے علم وفن کی سرپرستی جاری رکھی چراغ سے چراغ جلتا رہا اور علم و ادب کو اس سے روشنی ملتی رہی۔ یہ سلسلہ برسوں تک جاری رہا۔ جس دور میں دکن میں علم، تہذیب، تمدن اور ثقافت کے چراغ روشن تھے اس وقت ہندوستان کے دوسرے حصوں میں اندھیرا تھا۔

ابوالحسن تاناشاہ وہ آخری بادشاہ ہے جس کی وفات کے ساتھ ہی قطب شاہی خاندان کا چراغ بجھ گیا لیکن علم وفن کی وہ مشعل روشن کر گیا جو آج بھی فیض پہنچا رہی ہے۔

ابوالحسن تاناشاہ کو تاریخ نہیں بھلا سکتی۔ ایک قلندر جو بزرگانِ دین کے فیضانِ نظر کے باعث بادشاہ بن گیا تھا۔ اس کی نفاستِ طبع اور نازک مزاجی کے بے شمار افسانے لوگوں کی زبانوں پر ہیں اور گولکنڈہ کے کھنڈر اس کے گواہ ہیں۔

ابوالحسن تاناشاہ کا نام اس وقت تک زندہ رہے گا جب تک تاریخ میں اورنگ زیب عالمگیرؒ کا نام روشن ہے۔ مغل سلطنت کا آخری تاجدار محی الدین محمد اورنگ زیبؒ قطب شاہی سلطنت کے آخری سلطان ابوالحسن تاناشاہ کو زیر کر کے اورنگ آباد (دکن) کو اپنا پایہ تخت بنایا ہے۔

اورنگ آباد کو صرف اسی لئے تاریخی اہمیت حاصل نہیں ہے کہ وہ پایۂ تخت رہ چکا ہے بلکہ اس کی خاک میں جاہ وجلال رکھنے والے سلاطین بھی محوِ خواب ہیں اور یہ بارہ سو اولیائے اکرام کی آخری آرام گاہ بھی ہے اور اجنتہ وایلورہ کے غار ہندو ثقافت اور نقاشی کے واحد یادگار ہیں ۔

اس سرزمین میں ایک ایسی ہستی بھی محو خواب ہے جس کو تاریخ نظام الملک آصفجاہ اول بانی مملکتِ اسلامیہ آصفیہ کے نام سے یاد کرتی ہے ۔

---

# نظام الملک آصفجاہ اوّل

## بانیٔ مملکتِ اسلامیہ آصفیہ

نظام الملک آصفجاہ اوّل کا نسبی سلسلہ شیخ الشیوخ شہاب الدین سہروردیؒ تک پہنچتا ہے۔ آصفجاہ اول کے جد بزرگوار خواجہ میر عابد سمرقند کے رہنے والے تھے اور تحصیلِ علم کے بعد بخارا منصب قضاۃ پر فائز ہوئے۔ آصفجاہ کے اب وجد شاہ جہاں کے عہد حکومت میں ہندوستان آئے تھے۔ اور مغلیہ سلطنت میں مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ خواجہ میر عابد کو اورنگ زیب عالمگیرؒ نے "قلیچ خاں" کا خطاب دیا تھا اورنگ زیب نے جب دکن پر حملہ کیا تو خواجہ میر عابد سپہ سالار کی حیثیت سے شریک ہوئے اور اسی جنگ میں لڑتے ہوئے مارے گئے۔

آصفجاہ اول کے پدرِ نامدار میر شہاب الدین خاں کی ولادت توران میں ہوئی۔ ۱۶۶۸ء میں ہندوستان آئے اور دربارِ عالمگیری سے منسلک ہو گئے۔ میر شہاب الدین خاں نے اہم فوجی خدمات انجام دیں۔ عالمگیر نے ان کو مرہٹوں کی سرکوبی کے لئے مقرر کیا۔ انہوں نے مرہٹوں کو شکست دی۔ عالمگیرؒ

نے ان کی ان خدمات کے صلے میں فیروز جنگ کا خطاب مرحمت فرمایا، عالمگیرؒ کو دکن کی مہمات میں جو کامیابیاں ہوئیں اس کا سہرا فیروز جنگ میر شہاب الدین خاں کے سر ہے۔ انہوں نے ۱۶۸۱ء میں چنبیر کے سرکشوں کی گوشمالی کی۔ ۱۶۸۳ء میں قلعہ راہیر جو سبنھا مرہٹہ کی جائے پناہ تھا فتح کیا۔ بیجاپور کے محاصرے میں شہزادہ اعظم دشمنوں میں محصور ہو گیا تھا تو فیروز جنگ اور ان کے بھائی مجاہد خاں بہادر نے حکمت عملی اور بہادری سے کام لے کر دشمنوں کے گھیر کو توڑا اور شہزادے کی جان بچائی۔ انہوں نے گولکنڈہ کی جنگ میں کارہائے نمایاں انجام دئے۔ اورنگ زیبؒ نے ان کی خدمات کے صلہ میں دعا دی کہ "جس طرح فیروز جنگ نے تیموری خاندان کی عزت بچائی ہے۔ خدا سے اور اس کی اولاد کو بھی تا قیامت باآبرو رکھے"۔

عالمگیر نے ان کو "فرزند ارجمند" کا خطاب مرحمت فرمایا اور وقائع نگار کو یہ حکم دیا کہ "بیجاپور کی فتح کو "فیروز جنگ" کے نام لکھے" اور اسی پر اکتفا نہیں کی بلکہ خود اس نے اپنے قلم سے یہ فقرہ درج کیا۔

"قلعہ بیجاپور بہ دستیاری فرزند بے ریو ورنگ غازی الدین بہادر فیروز جنگ مفتوح شد"

اورنگ زیبؒ کی رحلت کے بعد اس کے جانشینوں میں بہادر شاہ نے ۱۷۰۸ء میں گجرات کی صوبہ داری پر فیروز جنگ کا تقرر فرمایا جہاں

دو برس کے بعد ان کا انتقال ہوا اور ان کا جنازہ دہلی لایا گیا اور اجمیری دروازہ کے پاس اپنی تعمیر کردہ خانقاہ میں دفن کئے گئے۔

میر شہاب الدین خاں فیروز جنگ کی شادی نواب عمدۃ الملک سعد اللہ خاں وزیر اعظم شاہ جہاں کی صاحبزادی سے ہوئی تھی جن کے بطن سے نواب میر قمر الدین خاں بہادر نظام الملک آصفجاہ اوّل پیدا ہوئے۔

نظام الملک کا نام میر قمر الدین خاں تھا۔ ان کے اب و جد ترکمان تھے لیکن ان کی والدہ شاہجہاں کے وزیر اعظم سعد اللہ خاں کی بیٹی تھیں۔ آصفجاہ اوّل ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ ان کی تربیت دکن کے ماحول میں ہوئی۔ بہت سی لڑائیاں انکی آنکھوں کے سامنے لڑی گئیں تھیں۔ اورنگ زیبؒ نے ان کو دیکھ کر کہا تھا کہ "اُس کی جبیں پر اقتدار کا ستارہ چمک رہا ہے"۔ عالمگیر نے نوعمری میں ان کو منصب اور سوار عطا کئے اور ان کی بہادری سے متاثر ہو کر "چین قلیج خاں" کا خطاب دیا اور بیجاپور کا گورنر بنا دیا۔ عالمگیرؒ کے انتقال کے بعد فرخ سیر کے عہد میں ان کو نظام الملک کا خطاب ملا اور وہ دکن کے گورنر بنا دئے گئے۔ دکن کی سیاست کو ان سے بہتر کوئی اور نہیں سمجھ سکتا تھا اور ان کے سوا کوئی اور مرہٹوں کی طاقت کا جواب نہیں دے سکتا تھا لیکن شمالی ہند میں سادات بارہہ (سید برادران بادشاہ گر) کے مکر و فریب کی حکمرانی تھی اور وہ ترکمان خاندان کے دشمن تھے ان کی شازش کی وجہ سے نظام الملک کو دکن سے

واپس بلایا گیا اور مراد آباد کا گورنر بنا دیا گیا سادات بارہہ نے فرخ سیر کو قتل کروا دیا اور رفیع الدولہ اور رفیع الدرجات کو تخت نشین کر دیا اور جب یہ مر گئے تو ۱۷۲۰ء میں روشن اختر محمد شاہ کو تخت نشین کر دیا۔

نظام الملک آصفجاہ اول اوران کا خاندان مغل شہنشاہ کا وفادار تھا۔ سید برادران نے نظام الملک کو مرکز سے دور رکھنے کے لئے پٹنہ کی گورنری کی پیشکش کی لیکن نظام الملک نے اس کو مصلحت کے خلاف سمجھ کر پیشکش ٹھکرا دی۔ ان کے اس انکار کے بعد مالوہ جانے کو کہا گیا۔ نظام الملک نے اس شرط کے ساتھ مالوہ کی گورنری کو قبول کر لیا کہ ان کو وہاں سے معزول نہیں کیا جائے گا۔ کچھ عرصہ کے بعد سادات بارہہ نے محسوس کیا کہ نظام الملک کو مالوہ بھیجنا بڑی غلطی تھی کیونکہ اس طرح سے ان کو دکن کا راستہ دیا گیا۔ سید برادران نے نظام الملک کو معزول کرنے کے احکامات بھیج دئے لیکن نظام الملک نے دکن کا راستہ اختیار کیا اور برہان پور میں مستحکم ہو گئے۔ سادات بارہہ نے ان کو زیر کرنے کے لئے فوجیں بھجوائیں۔ نظام الملک نے ان فوجوں کو شکست دی۔

۱۷۲۱ء میں نظام الملک اورنگ آباد پر قابض ہو گئے۔ ان کی یہ جنگ وہ سید برادران کی مخالفت میں ہوئی۔ جب سید برادران (بادشاہ گر) کا انتقال ہو گیا اور محمد شاہ سید برادران کے چنگل سے آزاد ہو کر ذی اختیار ہو گئے تو

ان کی نظر نظام الملک پر پڑی اس لئے کہ کوئی اور شخصیت ایسی نہ تھی جو امورِ سلطنت انجام دے سکتی تھی۔ نظام الملک اور ان کے خاندان کی مغلیہ سلطنت سے وفاداری غیر متزلزل تھی چنانچہ محمدؐ شاہ نے ۱۷۲۲ء میں انھیں دہلی بلایا اور آصفجاہ کا خطاب دیا اور وزیر اعظم کی خدمت جلیلہ سے سرفراز کیا۔ نظام الملک اس خدمت کو اپنا عین فرض سمجھتے تھے اس لئے وہ فوراً اپنے فرائض میں منہمک ہو گئے۔ انھوں نے آئندہ اصلاح نظم ونسق کا ایک جامع منصوبہ تیار کیا۔ اس پر عمل کیا جاتا تو مغل سلطنت ہمیشہ کے لئے نہیں تو کم از کم ایک صدی کے لئے مستحکم ہو جاتی لیکن دربار کی سازشوں کے باعث ان کے منصوبہ پر عمل نہیں کیا گیا۔ محمدؐ شاہ کے نااہل درباری نہ صرف ان کی مخالفت کرتے تھے۔ بلکہ ان کے وضع قطع اور لباس کا مذاق اڑاتے تھے۔ نظام الملک نے دو سال تک وفاشعاری کے ساتھ خدمات انجام دیں اور بالآخر دل شکستہ ہو کر دکن کی راہ لی۔ محمدؐ شاہ نے صوبہ دار اورنگ آباد مبارز خاں کو مزاحمت کرنے کا حکم دیا۔ شکر کھیڑہ کے مقام پر مبارز خاں اور نظام الملک میں گھمسان کی لڑائی ہوئی اور مبارز خاں مارا گیا۔ نظام الملک آصفجاہ اول ۱۷۲۴ء میں کامیاب فاتح کی حیثیت اورنگ آباد میں داخل ہو گئے۔ اسی تاریخ سے سلطنت آصفیہ کی ابتداء ہوتی ہے۔

اورنگ زیب عالمگیرؒ کے انتقال کے بعد مغلیہ سلطنت اقتدار کی کشمکش

اور سازشوں کا شکار ہو گئی تھی ۔ بدامنی، خانہ جنگی اور نااہل بادشاہوں نے مغلیہ سلطنت کی بنیادوں کو کھوکھلا کر دیا اور ریاستیں خود مختار ہو گئیں ۔ دکن میں مرہٹہ مغلیہ سلطنت کے لئے ہمیشہ دردِ سر بنے رہے خود عالمگیر کو مرہٹوں نے برسوں تک پریشان رکھا۔ اورنگ زیب کے انتقال کے بعد مرہٹہ پیشواؤں کی حکومت تمام دکن پر چھانے لگی۔ اگر آصفجاہ اول دکن میں اپنی عملداری قائم نہ کرتے تو دکن میں سوائے مرہٹوں کے اور کچھ نہ ہوتا۔ اگر اورنگ زیب کا تسلط نہ ہوتا تب بھی بیجاپور اور گولکنڈہ کی سلطنتیں مرہٹوں کے زیر اثر آ جاتیں نظام الملک آصفجاہ اول نے دکن کو الگ کر کے شہنشاہ اورنگ زیب کے منصوبہ کی تکمیل کر دی اور اسلامی تمدن کی نہ صرف حفاظت کی بلکہ اس کو پروان چڑھایا ۔

شمالی ہند میں جب مغلیہ سلطنت، مغلیہ تہذیب اور تمدن کا چراغ گل ہو گیا تو آصفجاہ اول نے اس چراغ کو دکن میں دوبارہ روشن کیا جس نے آصفجاہی سلطنت کی صورت میں ڈھائی سو برس تک مغل تہذیب اور اسلامی روایات کو تابندہ و درخشاں رکھا۔ مغل سلطنت کی صد ہا روایتوں کو زندہ رکھا اور دکن کی تمدنی اور علمی بساط از سر نو بچھائی کیونکہ تسخیر گولکنڈہ کے بعد سے علم و فن کی یہ شمع گل ہو گئی تھی ۔

نظام الملک نے خود مختاری کا اعلان کبھی نہیں کیا۔ تختِ شاہی اور چتر

نہیں استعمال کئے مغلوں کا سکہ جوں کا توں رکھا۔ ان چیزوں کو وہ اپنی وفاداری کے خلاف سمجھتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ مغل سلطنت کی ہر خدمت کے لئے تیار رہتے تھے۔ شکر کھیڑہ کی جنگ کے بعد محمدؐ شاہ کو وفادارانہ الفاظ میں مخاطب کیا تھا کہ "میں حالتِ مجبوری میں دکن آیا ہوں کیونکہ شاہی دربار نے مجھ سے کوئی کام نہیں لیا اور وہاں میں اپنی وفاداری کا ثبوت نہیں دے سکتا تھا لیکن میں یہاں سے شہنشاہ اور مغل سلطنت کی ہر خدمت کے لئے تیار ہوں" چنانچہ نظام الملک نے ان الفاظ کی پوری پابندی کی۔

۱۷۳۹ء میں نظام الملک آصفجاہ اول مرہٹہ پیشوا باجی راؤ کے ساتھ سخت لڑائی میں مصروف تھے کہ نادر شاہ نے دہلی پر حملہ کیا۔ محمدؐ شاہ نے نظام الملک آصفجاہ اوّل کو دہلی بلایا۔ نظام الملک فوراً دہلی چلے گئے کیونکہ شہنشاہ کی مدد بھی ضروری تھی محمدؐ شاہ نادر شاہی حملے کے سبب بے انتہا پریشان تھا بقول اسی کے

دیدۂ عبرت کشا و قدرتِ حق رابہ بیں

شامتِ اعمال ما صورتِ نادر گرفت

تاریخ نظام الملک آصفجاہ اوّل کے تدبر اور جرأت کے اس واقعہ کو کبھی نہیں بھول سکتی جب انھوں نے اپنے دورِ وزارت میں دہلی کے مسلمانوں کو ہلاکت اور خونریزی سے بچایا تھا۔

۱۷۳۹ء میں نادر شاہ جس کی خون آشام تلوار انسانی لہو چاٹ چاٹ کر شعلۂ جوالا بن چکی تھی دہلی میں فاتحانہ داخل ہوا۔ ایک افواہ نے دہلی کا چین وسکون لوٹ لیا۔ نادر شاہ کا جلال غضب میں آگیا اور وہ مسجد روشن الدولہ کی سیڑھیوں پر کھڑا ہوگیا۔ اس کی زبان " بزن بزن " کے شعلے اگلنے لگی دہلی کا سہاگ لوٹ گیا۔ اور نصف آبادی نادر شاہ کے جذبۂ انتقام کا شکار ہوجاتی ہے کہ نادر شاہ کے سامنے ایک پُر نور شخصیت نمودار ہوتی ہے۔ سفید پوشاک، سفید داڑھی، پُر نور چہرہ، گلے میں برہنہ تلوار حمائل نادر شاہ سے مخاطب ہو کر کہتی ہے۔

کسے نماند کہ اُو را بہ تیغ ناز کشی
مگر کہ زندہ کنی خلق را و باز کشی

نادر شاہ مبہوت ہو کر رہ جاتا ہے۔ شخصیت کا سحر اور الفاظ کا جادو اثر کر چکا ہے۔ شعر تیر بن کر سینے میں اُتر گیا۔ سنگ دل سراپا موم بن جاتا ہے اور بے اختیار کہہ اٹھتا ہے " بریشِ سفیدت بہ بخشیدم "

نظام الملک آصفجاہ اول نے اپنے جانشینوں کو تخت دہلی کا وفادار

رہنے کی وصیت فرمائی تھی چنانچہ جانشینوں نے اس وصیت پر پورا پورا عمل کیا۔ انھوں نے مغل بادشاہوں کو ہمیشہ عزت کی نظروں سے دیکھا۔ جب محمد شاہ کو لال قلعہ میں نظر بند کر دیا گیا اور محمد شاہ کی مالی حالت دگرگوں ہو گئی تو نظام نے محمد شاہ کو ”اشرفیاں“ بھجوائی تھیں۔

آصفجاہ اول کے انتقال کے بعد ان کے جانشینوں نے بھی کمال تدبر اور فراست کا ثبوت دیا۔ انتہائی نامساعد حالات میں آصفجاہی سلاطین ـــ ہمیشہ اپنی رعایا کے وفادار رہے۔ خصوصاً نظام علی خاں آصفجاہ ثانی کو ناگفتہ بہ حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ ہر طرف دشمنوں سے گھرے ہوئے تھے۔ یورپی اقوام ہندوستان پر اپنی گرفت مضبوط کرنے کے لئے ایک دوسرے کے خون کی پیاسی ہو رہی تھیں۔ بمبئی میں انگریز، گوا میں پرتگالی، پانڈیچری میں فرانسیسی ایک دوسرے کے حریف تھے۔ انگریز فرانسیسوں کو مغلوب کر کے اتنے طاقتور بن چکے تھے کہ ان کا کوئی مدِمقابل نہ تھا مرہٹے اپنی ازلی مسلم کش پالیسی کے تحت نظام کے دشمن ہو رہے تھے۔ نانا فرنویس نے حیدرآباد پر یلغار کر دی تھی۔ جس کے نتیجہ کے طور پر دولت آباد کا قلعہ اور دریائے تاپتی سے لیکر پرنیڈہ تک کا سارا علاقہ مرہٹوں کو دینا پڑا جس کی آمدنی ۳۵ لاکھ سالانہ تھی۔ پچھلا بقایا اور تاوانِ جنگ تین کروڑ روپیہ قرار پایا اور اس

پرطرّہ یہ کہ مرہٹوں نے اس کی ضمانت طلب کی چنانچہ ارسطو جاہ جیسے مُدبّر کو بر غمال کے طور پر مرہٹوں نے نظر بند کر دیا۔

ریاست حیدر آباد کے حدود میسور سے ملتے تھے اس لئے میسور سے اچھے اور بُرے تعلقات ہونے ضروری تھے۔ والیانِ میسور ہندوستان کے دیسی رئیسوں کے ساتھ اچھے تعلقات نہیں پیدا کر سکے اور یہ ان کی بہت بڑی غلطی تھی۔ ٹیپو سلطان نے فرانسیسیوں اور ان کے رہنما نپولین کے ساتھ تو روابط پیدا کر لئے تھے لیکن خود ہندوستان کی طاقتوں کے ساتھ ان کے تعلقات اچھے نہ تھے۔ اندرونی دشمن یعنی مرہٹے روز بروز طاقتور بنتے جا رہے تھے۔ اور ان کے حملوں کا دائرہ وسیع ہو رہا تھا۔ مرہٹے بڑھ بڑھ کر دہلی پر بھی حملے کر رہے تھے۔ ان کی اس بڑھتی ہوئی طاقت سے نظام، انگریز اور دیگر والیانِ ریاست متحد ہو جاتے اور ان کا قلع قمع کر دیتے تاکہ ان کے خاتمے کے بعد بیرونی دشمن یعنی انگریزوں کے خلاف کوئی قدم اٹھایا جا سکتا تھا لیکن نظام کی اس تجویز سے دیگر والیانِ ریاست نے اتفاق نہیں کیا حتیٰ کہ میسور نے حیدر آباد کی سیادت تسلیم نہیں کی اور ایک بڑی غلطی یہ کی کہ کرنول کا جھگڑا درمیان میں کھڑا کر دیا۔

ٹیپو ایک سپاہی کا بیٹا تھا اس لئے جذبۂ سرفروشی اُسے ورثہ میں

ملا تھا اور اسی جذبۂ سرفروشی نے اس کو انگریزوں کا دشمن بنا دیا تھا۔ وہ سیاست کی گرہوں کو نوکِ شمشیر سے کھولنا چاہتا تھا۔ ٹیپو سلطان اور انگریزوں میں جنگیں ہوئیں اور ٹیپو کو مصالحت کرنی پڑی حتیٰ کہ اپنے دو بیٹوں کو انگریزوں کے پاس بر غمال کے طور پر رکھنا پڑا۔ فرانسیسیوں کا ٹیپو سلطان پر بڑا اثر ورسوخ تھا۔ فرانسیسی اقتدار دم توڑ رہا تھا۔ ٹیپو خود نازک حالات سے دوچار تھا۔ درباری سازشوں، مکر وفریب نے ٹیپو سلطان کو بے بس کر دیا تھا اور وہ اس بات سے واقف تھا کہ اس کے گرد سازشوں کا دائرہ تنگ تر ہوتا جا رہا ہے۔ اس کے آستین میں سانپ پل رہے تھے۔ اور ریاستِ میسور غداروں کی آماجگاہ بنی ہوئی تھی۔ دربار کے عہدہ دار اور ٹیپو کے رشتہ دار خود ٹیپو کی جان کے دشمن ہو رہے تھے۔ میر صادق علی (ٹیپو کا چیف سکریٹری)، میر غلام علی لنگڑا (ترکی میں میسور کا سفیر) میر قمرالدین و میر معین الدین (ٹیپو سلطان کے سوتیلے ماموں) پورنیا، (ٹیپو کا وزیر اعظم)، میر قاسم (سرنگاپٹم کے قلعہ کا افسر) ان سب کی سازشوں سے ٹیپو سلطان پوری طرح واقف تھا۔ گھر کے یہی بھیدی تاریخ کے خونیں ڈرامے کے ذمہ دار تھے۔

ہندوستان میں سیاست بڑی پیچیدہ اور خطرناک صورت اختیار کرتی جا رہی تھی۔ والیانِ ریاست کے پیشِ نظر سلامتی، بقا اور تحفظ

کا سوال تھا۔ سیاست اور جذباتیت کے درمیان کشمکش تھی مصلحت تدبّر، فراست اور دانائی کے کچھ اور تقاضے تھے۔ نظام جلد بازی اور جذباتیت کے زیرِ اثر کوئی قدم ایسا نہیں اٹھانا چاہتے تھے کہ جس سے مغلیہ تہذیب اور اسلامی اقتدار کی واحد مظہر ریاستِ دکن جو صد ہا قربانیوں کے بعد قائم کی گئی تھی، ابھرنے سے پہلے ہمیشہ ہمیشہ ختم ہو جاتی۔

وہ اسلامی ریاست کی اس ٹمٹماتی شمع کو ہر حال میں روشن رکھنا چاہتے تھے۔ سیاست، تدبر اور جذبات کی اس جنگ میں تدبر کی جیت ہوئی۔ نظام علی خاں نے بوجھل دل کے ساتھ قدم اٹھایا اور دکن کی اسلامی سلطنت کو بادِ مخالف کے طوفانی تھپیڑوں سے بچا لیا ورنہ ہندوستان میں اسلامی سلطنت کا چراغ ہمیشہ کے لئے گُل ہو جاتا۔ اُن کے تدبُّر اور دور اندیشی نے وہ شمع جلائی جو ڈھائی سو برس تک اسلامی اقتدار کی مظہر، اسلامی تہذیب، روایات اور علم و فن کی امام محافظ اور امین بن کر رہی۔

دکن میں آصفیہ سلطنت کی ڈھائی سو سالہ بادشاہت کی پیشگوئی اسی وقت کر دی گئی تھی۔ جب نظام الملک دہلی سے واپسی پر ولیٔ کامل حضرت شاہ عنایت اللہؒ کی حاضری کے لئے گئے تھے۔ حضرت نے آصفجاہ اوّل کو اپنے دستر خوان پر بٹھا لیا اور روٹیاں پیش کیں آصفجاہ اوّل

نے کل سات روٹیاں کھائیں۔ حضرت شاہ عنایت اللہؒ نے اصفجاہ اوّل کو بشارت دی کہ "تمہاری سات پُشتیں بادشاہی کریں گی۔"

ولیٔ کامل کی یہ پیش گوئی صحیح ثابت ہوئی۔ سلطنت آصفیہ پر سات بادشاہوں نے حکومت کی۔ اس عظیم ریاست کے آخری بادشاہ اعلیٰحضرت میر عثمان علی خاں تھے۔ یہ عجیب بات ہے کہ سلطنت کی بنیاد ایک قلندر صفت بادشاہ نے رکھی اور اس کا خاتمہ بھی ایک قلندر صفت بادشاہ پر ہوا۔ تدّبر اور سیاست نے اس کی بنیاد رکھی تھی لیکن جذباتیت اور جلدبازی نے اس کا خاتمہ کر دیا۔

جہاں آفریں تا جہاں آفرید چنیں شہر یارے نہ آمد پدید

# شہر یارِ دکن

دکن کی تاریخ حسن وعشق، دولت و ثروت، علم وفن، تہذیب و ثقافت، زبان وادب، سیاست وقیادت کے دلچسپ، رنگین اور سادہ داستانوں سے مزّین ہے۔ ان داستانوں کا مرکزی کردار سلاطین آصفیہ کے آخری بادشاہ اعلیٰ حضرت میر عثمان علی خاں تھے ان کی ذات سے بیسیوں افسانے وابستہ کئے جاتے ہیں جن میں افسانوی رنگ زیادہ نمایاں ہے افسانے بہر حال افسانے ہیں اور حقیقتیں اپنی جگہ اٹل ہیں۔

اعلیحضرت میر عثمان علی خاں آصفِ سابع کی شخصیت بہت پہلودار اور رنگین تھی وہ بشر پہلے تھے اور بادشاہ بعد میں۔ چونکہ بشر تھے اس لئے بشری تقاضوں سے مجبور تھے بادشاہ کی حیثیت سے بادشاہوں کی۔ خصوصیات ان میں بدرجہ اتم پائی جاتی تھیں۔ وہ فرشتہ نہیں تھے۔ ان میں انسانی کمزوریاں بھی تھیں۔ کچھ تو ان کی اپنی تھیں اور بہت کچھ حاشیہ نشینوں کی پیدا کردہ تھیں۔ عمر کے ساتھ ساتھ ان کی شخصیت اور کردار میں نکھار آتا گیا۔ ان کی خوابیدہ صلاحیتیں اجاگر ہوتی گئیں، فکر و نظر میں

پختگی اور بلندی آتی گئی اور اعلیٰ صفات کمزوریوں پر غالب آگئیں اور وقت نے ان کی شخصیت میں پوشیدہ حسن کو اتنا نکھارا کہ جذبۂ عقیدت جذبۂ پرستش سے بدل گیا۔

آصف سابع انتہا پسند تھے چنانچہ ان کی ذاتی زندگی اور ان کے کارنامے اس کے گواہ ہیں بہ حیثیت بادشاہ ان میں کرّ و فر بھی تھا، جاہ و جلال بھی تھا۔ اور بادشاہوں کی توہم پرستی بھی تھی۔ وہ اپنے پیشرو سلاطین کے فرمودات پر عمل کرنا عبادت سمجھتے تھے۔ ان کی انتہا پسندی میں بھی ایک حسن تھا جو قوم، ملک، معاشرہ، تہذیب، تمدن، علم و فن، شعر و ادب اور ثقافت کے لئے ایک نعمتِ غیر مترقبہ ثابت ہوا۔ تاریخ کسی ایسے بادشاہ کی نظیر نہیں پیش کر سکتی جس کی انتہا پسندی تخریبی نہیں بلکہ تعمیری ہو۔

اعلیٰ حضرت میر عثمان علی خاں آصف سابع ۶ / اپریل ۱۸۸۶ء کو پیدا ہوئے۔ ان کی تعلیم و تربیت کے لئے اپنے وقت کے نامور اساتذہ مامور کئے گئے تھے۔ انگریزی کی تعلیم کے لئے سر برائین ایجرٹن SAR BRIAN EGERTON مامور کئے گئے تھے جن کے ساتھ قابل ترین انگریزوں کی ایک جماعت تھی عربی، فارسی اور اسلامیات کی تعلیم معز یار الدولہ بہادر دیا کرتے تھے جو اپنے وقت کے قابل ترین شخص تھے۔ اسلامی فقہ اور شریعت کی تعلیم ممتاز عالموں سے حاصل کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اعلیٰحضرت کو اردو، فارسی،

عربی اور ترکی اور انگریزی زبانوں پر عبور حاصل ہوگیا وہ ان زبانوں سے شدید واقفیت نہیں رکھتے تھے بلکہ اہلِ زبان کی طرح روانی کے ساتھ بولتے اور لکھتے تھے۔ صرف زبانوں ہی کی تعلیم پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ سیاست اور امور سلطنت کی پیچیدہ گتھیوں کو سلجھانے کی تربیت بھی دی گئی۔ تعلیم کے بعد فرصت کے اوقات لہو و لعب میں گزارنے کی بجائے حضور نظام اپنے آپ کو شکار، شہسواری اور دوسرے کھیلوں میں مصروف رکھتے ابتدائے دورِ حکومت میں آپ نے اپنی ریاست کے طول طویل دورے کئے۔

۱۹۱۱ء میں جب زندگی کی پچیسویں بہار آئی تو ان کے کندھوں پر ایک عظیم ذمہ داری آن پڑی۔ وہ ولی عہد سے تاجدار بن گئے پچیس برس کا نوجوان ایک ایسی ریاست کا تاجدار بنتا ہے جس کا رقبہ یورپ کے کئی ملکوں کے رقبہ سے بڑا تھا۔ جب انھوں نے تخت و تاج سنبھالا تو ریاست کی مالی حالت دگرگوں تھی۔ بے شمار مسائل اژدہے کی طرح منہ کھولے ہوئے تھے، خزانہ خالی ہوچکا تھا۔ ایسے ہوشربا حالات میں پچیس برس کا یہ جوان عزم و ہمت، قوتِ ارادی، قوتِ فیصلہ اور سب سے بڑھ کر تائید ایزدی کے بل بوتے پر ایک عہد کرتا ہے کہ

"میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں اپنے عوام اور ریاست کی بھلائی کے لئے ہر ممکن کوشش کروں گا۔"

تاریخ نے یہ ثابت کر دکھایا کہ یہ وقتی اور جذباتی عہد نہیں تھا! اعلحضرت نے دکن کے مردہ جسم میں نئی روح پھونک دی اور ایک خزاں رسیدہ چمن کو رشکِ بہشت بنا دیا۔

دکن کی ناگفتہ بہ حالت کو سدھارنے کے لئے بے شمار قربانیوں کی ضرورت تھی معاشی استحکام کے لئے ضرورت اس امر کی تھی کہ کفایت شعاری اختیار کی جائے چنانچہ آصفِ سابع نے کفایت شعاری کی ملک گیر مہم چلائی لیکن یہ مہم صرف عوام کے لئے نہیں تھی بلکہ نظام نے بہ نفسِ نفیس کفایت شعاری اختیار کی۔ ایوانِ شاہی کے اخراجات گھٹا دیئے گئے امراء مصاحب اپنے آقائے ولی نعمت کی کفایت شعاری کو دیکھ کر خود بھی کفایت شعار ہو گئے اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ملک کا مالیہ مستحکم ہوگیا، ریاست کا خزانہ بھرتا گیا اور ملک خوشحال ہوگیا۔ ایک وقت ایسا بھی آ پہنچا کہ دکن کی ریاست دولتمند ترین ریاست کی حیثیت سے سارے عالم میں مشہور ہوگئی۔

اعلحضرت دنیا کے دولتمند ترین انسانوں میں سے ایک گنے جاتے تھے۔ انکی دولت کے افسانے دکن اور ہندوستان سے باہر یورپ میں بھی بیان کئے جاتے ہیں۔

لندن کے اخبارات ڈیلی ٹیلیگراف اور ڈیلی اکسپرس نے ان کے متعلق

کے بارے میں بارہا قیاس آرائی کی۔ ایک فرانسیسی اخبار کے نامہ نگار نے ۱۹۳۶ء
میں حضور نظام سے شرف ملاقات حاصل کر کے سوال کیا کہ "کیا یہ سچ ہے کہ اعلیٰحضرت
کی دولت ایک سو ملین پونڈ (تقریباً ایک ارب تیس کروڑ روپیے) ہے۔ تو
اعلیحضرت نے جواب دیا کہ "اگر سچ پوچھو تو خود مجھے بھی اپنی دولت کا اندازہ
نہیں۔ ممکن ہے سو ملین پونڈ ہو۔ ممکن ہے اس سے بھی زیادہ ہو ممکن ہے کم ہو۔
مجھے یقین ہے کہ میرا کوئی عہدہ دار بھی میری دولت کا صحیح اندازہ نہیں رکھتا۔"
خود حیدرآباد دکن میں حضور نظام کی دولت کے افسانے مشہور رہتے۔
جتنے منہ اتنی باتیں تھیں کوئی کہتا تھا کہ سونے کی اینٹوں سے بھری ہوئی موٹریں
ہیں۔ کوئی خزانہ پر اژدہوں کی حکومت کے قصے سناتا۔

اس میں شک نہیں ہے کہ حضور نظام کے پاس زر و جواہر اور مال و
دولت کی کمی نہیں تھی۔ ان کے پاس ایسے ہیرے موجود تھے کہ جنہیں دیکھ کر
جوہریوں کو غش آگئے تھے۔ بیرون ہند سے جوہری ایسے ایسے ہیرے لے
آتے تھے جن کو خریدنے کی کسی میں ہمت و طاقت نہیں تھی لیکن وہ کبھی نظام
کے دربار سے خالی ہاتھ نہیں جاتے تھے۔

آصف سابع کا سب سے بڑا مشغلہ دولت جمع کرنا تھا۔ دولت جمع
کر کے ان کو مسرت حاصل ہوتی تھی۔ زندگی اور اس کی مسرتیں حاصل کرنا
انسانی فطرت میں داخل ہے۔ ذوق اور شوق کی تسکین اور مسرت حاصل

کرنے کے لئے انسانوں نے کیا کچھ نہیں کیا۔ کسی نے انسانیت کے لبادے کو اتار پھینکا کسی نے شہروں کو جلا کر، انسانیت کی چیخوں کو سن کر، انسانی کھوپڑیوں کے مینار بنا کر، کتب خانوں کو جلا کر، لہلہاتی کھیتیوں کو اجاڑ کر، خلوت کدوں کو رنگین بنا کر بے پناہ مسرت حاصل کی۔ کسی نے فنونِ لطیفہ، سیر و شکار اور تفریح کو اپنا کر مسرت حاصل کی۔

روئے زمین پر ایسے بادشاہ بھی گزرے ہیں جن کی شان و شوکت کے ذکر سے تاریخ کے ابواب بھرے پڑے ہیں۔ ان کا تمول و تعیش آج بھی ضرب المثل ہے۔ کتنے بادشاہ ایسے بھی تھے جنھوں نے رعایا کی خون پسینے کی کمائی سے اپنے خزانے بھر لئے، رعایا پر وہ ظلم و ستم توڑے کہ ان کا تصوّر کر کے آج بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ان کے جذبۂ عیش و عشرت نے اپنی تسکین کے لئے کتنے ہی ستم ایجاد کئے، کتنی منہ بند مہکتی کلیوں کو تزئینِ حرم کی خاطر نوچ لیا۔

اُن بادشاہوں کی دولت نے اپنی مسرت کا سامان تو فراہم کر لیا لیکن تہذیب و تمدن، ثقافت، علم و فن، روایات اور اقدار، سماج اور معاشرہ، صنعت و حرکت غرضکہ ہر شعبۂ زندگی پر جمود طاری کر دیا۔ نکبت و افلاس نے رعایا کی حالت دگرگوں کر دی۔ جہالت نے عوام کی قوتِ فکر و عمل کو سلب کر دیا۔ ان بادشاہوں نے عوام سے دولت شاید اسی لئے چھین لی کہ نہ دولت ہوگی، نہ علم ہوگا اور نہ ان کے شعور کی تربیت ہوگی۔ انھیں پیٹ اور روٹی کی فکر میں اس طرح

مبتلا کر دیا جائے کہ ان کی نسلیں بھول کر بھی ایوان شاہی کی برجیوں کی طرف نگاہ اٹھا کر نہ دیکھ سکیں۔

تاریخ اس امر کی بھی شاہد ہے کہ جن بادشاہوں نے اس طرح اپنی زندگی کو جنت بنا یا وہ بیوقوفوں جنت تھی۔ استبداد اور جور و ستم سے تنگ آکر مظلوموں نے ان کے خزانوں کو لوٹ لیا ناز و نعم میں پلے ہوئے جسموں کو بازاروں میں گھسیٹا، ایوانات شاہی کو جلا کر بھسم کر ڈالا، ریشم و کمخواب میں ملبوس جسموں کو سر بازار ننگا کر دیا اور جو اُن بھوکے عوام کے جذبۂ انتقام سے بچ گئے وہ اپنے وطن سے دور بے کسی اور بے بسی کی موت مرے کہ ان کی موت پر آنسو بہانے والا کوئی نہ تھا۔ فرعون صفت بادشاہوں کا کیسا عبرت ناک انجام ہوا۔

اسی دور کی تاریخ میں ایک بادشاہ بھی گزرا ہے جو دنیا کا دولتمند ترین بادشاہ تھا۔ جس نے ۳۸ برس حکمرانی کی۔ جاہ و جلال اس کے قدموں تلے تھا لیکن انھوں نے کسی کے گھر کو لوٹ کر دولت جمع نہیں کی، کسی کا سہاگ نہیں لوٹا، کسی معصوم کی بددعا نہیں لی۔ اس کا جلال ظالموں کے لئے قہر تھا، بجلی تھا، آتش فشاں تھا لیکن وہ غریب کے لئے سراپا جمال بن جاتا تھا۔ حضور نظام اگر چاہتے تو اپنے لئے بیسیوں محل تعمیر کروا سکتے تھے، اپنے لئے تخت طاؤس بنوا سکتے تھے لیکن انہیں بے جا اسراف سخت ناپسند تھا۔ انہوں نے امراء و جاگیردارو

سے نذرانے لیئے جتنا ان سے لیا اس سے دگنا بلکہ سہ گنا اپنی رعایا پر نچھاور کر دیا۔ ان کے دور میں تہذیب، تمدن، علم و فن، صنعت و تجارت کو اتنا عروج ہوا کہ ان کی اپنی علیحدہ تاریخ ہے۔ حضور نظام کی غریب پروری نے انھیں قابلِ پرستش بنا دیا تھا۔ ان کی غیر مسلم رعایا ان کی پوجا کرتی تھی۔

حضور نظام نے بے انتہا دولت جمع کی تھی وہ دولت جمع کرنے میں حق بجانب بھی تھے۔ دولت جمع کرنے میں جہاں ان کے فطری جذبہ کو دخل ہے۔ وہاں ملک کی سیاست۔ تاریخی حقائق، انگریزوں کی ریشہ دوانیوں اور سلاطین آصفیہ کے دو سو سالہ دور کی تاریخ کا بھی بڑا حصہ ہے۔ حضور نظام کے پیشِ نظر ان کے اسلاف کا دو سو سالہ دور تھا۔ فراست اور دانائی کا تقاضہ یہ تھا کہ وہ اپنی ریاست کو مالی حیثیت سے مضبوط اور طاقتور بنا دیں تاکہ وہ کسی کی محتاج نہ رہے تاریخ نے ان کو یہ سبق سکھایا تھا کہ سلاطین آصفیہ کو مالی دشواریوں کے سبب کسقدر نقصان اٹھانا پڑا تھا، ملک کے دفاع میں اکثر ناکامیوں کا منہ دیکھنا پڑا اور انھیں مرہٹوں کے ساتھ جنگوں میں انگریزی حکومت سے مدد کا طالب ہونا پڑا جس کے نتیجے کے طور پر اپنی وسیع حکومت کا نصف سے زیادہ حصہ انگریزوں کی مدد کے صلے میں نذر کرنا پڑا۔

دولت جمع کرنے کا ایک سبب آصفجاہ اول کی وہ نصیحت ہے جو انہوں نے دمِ آخر اپنے جانشینوں کو کی تھی کہ "بادشاہ کی

ہونی چاہیئے" اس نصیحت میں جو مصلحت پوشیدہ تھی وہ کسی تشریح کی محتاج نہیں ہے۔

دولت جمع کرنے میں حضور نظام کے ایک توہم کو بھی کافی دخل ہے ۔سلطنت آصفیہ کے بانی آصفجاہ اوّل کو ایک درویش نے سات روٹیاں دیتے ہوئے کہا تھا کہ ان کی سات پشتیں بادشاہت کریں گی"۔ حضور نظام خاندان آصفجاہی کے ساتویں بادشاہ تھے۔ یہ وہم ہو یا حقیقت یہ حضور نظام نے پیش بندی کے طور پر دولت جمع کرلی تھی۔ چنانچہ ان کی دور اندیشی، ان کا توہم، دولت سے ان کی محبت اور تاریخ کے ایک سبق نے ان کو اتنا دولتمند کردیا کہ ان کی دولت ہندوستان میں مسلمانوں کی تہذیب، ثقافت، علم وفن کی نشاۃ ثانیہ کا سبب بنی،

دولت جمع کرنے کی اس بے پناہ خواہش کے باوجود حضور نظام نے حکومت (عوامی خزانہ) سے اس رقم کے علاوہ ایک پائی بھی زیادہ نہ لی جو سربراہ مملکت کی حیثیت سے حکومت نے پچیس لاکھ سالانہ روپے منظور کی تھی۔ ان کی اپنی جاگیر (جو "صرفِ خاص مبارک" کہلاتی تھی) کی آمدنی ۳ کروڑ روپے سالانہ تھی۔

دولت سے انکی محبت اور ان کی کفایت شعاری کو لوگ کنجوسی سے تعبیر کرتے ہیں، اور رنگ آمیزی کے ساتھ افسانے بیان کرتے ہیں۔ کنجوسی اسکو کہتے ہیں کہ انسان اپنا مال دوسروں پر تو کجا خود اپنی ذات پر بھی خرچ نہ کرے۔ یہاں تو عالم ہی دوسرا تھا۔ کروڑوں کی دولت کا مالک اپنے لئے کچھ نہیں خرچ کرتا تھا لیکن دوسروں کیلئے لاکھوں اور کروڑوں لٹا دیتا تھا۔ اعلیحضرت کی سخاوت اور فیاضی کا ایک زمانہ گواہ ہے اور ان کی دریادلی کے ایسے ثبوت موجود ہیں کہ جن کو تاریخ کبھی فراموش نہیں کرسکتی۔

# شہ پارے

آصفِ سابع بادشاہ ہوتے ہوئے بھی فقیر تھے، قلندر تھے، درویش تھے، انکا فقر درویشوں اور قلندروں کے لئے بھی قابلِ تقلید تھا. کتنی عجیب بات ہے کہ انھوں نے خود فقیری کی زندگی کو اپنایا لیکن دوسروں کو اپنی نوازشات اور عنایات سے اسقدر مالامال کر دیا ہو کہ ان کی نسلیں بھی فکرِ معاش سے بے نیاز ہو گئیں. حضورِ نظام کی داد و دہش سے دین، علم و فن اور اسلامی روایات کا نہ صرف احیا ہوا. بلکہ ان کو استقلال بھی نصیب ہوا۔

**سادگی:۔** بادشاہی میں قلندری کی اس سے بہتر کیا مثال ہو سکتی ہے کہ حضور نظام کا لباس سادگی کا اعلیٰ ترین نمونہ ہوا کرتا تھا.

ململ کا کرتا، لٹھے کا پاجامہ، سادہ سوتی شیروانی، بغیر پھندنے کی ٹوپی سلیم شاہی جوتا. یہ لباس اس وقت زیب تن فرماتے تھے جب دربار میں ہوتے یا انہیں کنگ کوٹھی سے باہر نکلنا ہوتا تھا ورنہ گھر میں ایک کرتا اور ایک لنگی زیبِ جسم رہتی تھی. ان کے جملہ لباس کی قیمت پندرہ روپے سے زیادہ نہیں ہوتی تھی.

ہم میں سے کتنوں کے لباس کی مجموعی قیمت پندرہ روپے ہے ؟؟؟

ایک صحافی سنت نہال سنگھ کو حضور نظام کے حضور حاضری کی عزت

نصیب ہوئی۔ وہ لکھتے ہیں کہ

"جب میں اعلیٰحضرت کی بارگاہ میں پیش ہوا تو آپ کا کل لباس زیادہ سے زیادہ دس روپیہ کا ہوگا۔ بعض لوگوں نے کہا کہ حضور پر تکلف لباس زیب تن فرمایا کریں تو ارشاد ہوا کہ میرے سرور آقا صلی اللہ علیہ وسلم کا لباس اس سے بھی معمولی تھا جتنا کہ میرا ہے"

سید کشفی شاہ نظامی بہت ہی سادہ مزاج اور درویش صفت مسلمان ہیں ۲۳ فروری ۱۹۳۳ء کو انہیں شرفِ حضوری کا موقع ملا۔ ان پر اعلیٰحضرت کی شخصیت اور سادگی کا جو اثر ہوا اس کو انہوں نے یوں بیان کیا۔

"مجھ پر اعلیٰحضرت کی سادگی، متانت اور شاہانہ وقار کا بہت بڑا اثر ہوا اور میں نے اعلیٰحضرت کو خلفائے راشدین کا نمونہ پایا"

مسٹر ایم۔ اے غنی بیرسٹر اٹ لا (لاہور) لکھتے ہیں کہ:۔

"میں حضور ولی عہد بہادر ریاستِ خیر پور (سندھ) کی شادی کے سلسلے میں حیدرآباد دکن گیا تھا چونکہ ممدوح کی شادی نواب معین الدولہ بہادر والیٔ پائیگاہ کے ہاں ہوئی ہے شادی میں شرکت کے لئے حضور نظام آنے والے تھے۔ میں نے دیکھا کہ خانہ باغ کے بڑے کمرہ سے کوَچ اور غالیچے اٹھائے جا رہے ہیں۔ دریافت پر معلوم ہوا کہ ان کی بجائے معمولی کوَچ اور غالیچے بچھائے جائیں گے کیونکہ اعلیٰحضرت عمدہ کاوَچ اور قیمتی

غالیچوں کے استعمال کو پسند نہیں فرماتے اور اسے فضول خرچی سمجھتے ہیں۔

اعلیٰحضرت کو دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ بادشاہوں کی وہ تصویر جو ہمارے تخیل میں ہر وقت رہتی ہے بالکل مفقود ہو گئی۔ اور اپنے سامنے محفل نے ایک نہایت ہی معمولی انسان کو نہایت معمولی کپڑے پہنے دیکھا۔ اسی وقت مجھے حضرت عمرؓ یاد آ گئے اور فتح شام کا واقعہ میری آنکھوں کے سامنے آ گیا۔

چائے نوشی کے وقت دیکھا کہ ایک معمولی خانساماں معمولی چینی کی چائے دانی میں چائے لگا کر حاضر ہوا۔ اعلیحضرت نے ذرا آگے بڑھ کر اپنے ہاتھ سے خود ہی اپنے لئے چائے بنائی۔ میرے لئے یہ نظارہ نہایت ہی تعجب انگریز تھا۔ بھلا جو شخص میر صاحب خیرپور کے زمانہ عروج میں ان کا ایک مقرب ملازم بحیثیت مشیر قانونی رہ چکا ہو اور جس نے چیمبر آف پرنسس، گورنروں اور وائسراؤں کی دعوت میں شامل رہا ہو اس کے لئے ہندوستان کے سب سے بڑے والئی ریاست اور دنیا کے سب سے بڑے دولت مند شخص کا اس طرح چائے پینا تعجب چیز کیوں نہ ہوتا۔

**سادگی اور فیاضی کی ایک اور مثال:۔** حضور نظام ایک معمولی

چارپائی پر سویا کرتے تھے۔ ایک معمولی سا بستر، ایک تپلی سی توشک، ایک چادر اور ایک تکیہ۔ سردیوں میں ایک کمبل استعمال کرتے تھے جو کثرتِ استعمال سے پھٹ گیا تھا۔

جب کمبل استعمال کے قابل نہیں رہا تو حضور نظام نے صمدیار جنگ (بھوپال کے صاحبزادہ عبدالحمد خاں جو پیشی کے افسر تھے) کو حکم دیا کہ میرا کمبل پھٹ گیا ہے اور سردیوں میں گزارا مشکل ہے اس لئے نیا کمبل لایا جائے جس کی قیمت چودہ روپے سے زائد نہ ہو۔

پیشی کے افسر نے سارے شہر کی خاک چھان ڈالی لیکن چودہ روپے کا کمبل کہیں نہیں ملا۔ معمولی سے معمولی کمبل کی قیمت سولہ روپے تھی۔ افسر داروغۂ جیل سے ملے اور چودہ روپے کا کمبل خریدنا چاہا۔ داروغہ جیل نے انھیں بتایا کہ جو کمبل قیدی استعمال کرتے ہیں اس کی قیمت بھی سولہ روپے سے کم نہیں ہے۔ لیکن جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ کمبل حضور نظام کے لئے چاہیئے تو انھوں نے چاہا کہ سولہ روپے کا کمبل چودہ روپے میں دیدیں اور رسید چودہ کی بنادیں لیکن افسر نے کہا کہ نہیں، حضور نظام کو ہر بات کی خبر رہتی ہے (یہ اس امر کا ثبوت ہے کہ حضور کتنے باخبر رہا کرتے تھے)

افسر پیشی نے حضور نظام کے سامنے ساری صورتِ حال

رکھدی اور اجازت چاہی کہ سولہ روپے کا کمبل خرید لیا جائے اس فقیر منش بادشاہ نے جواب دیا "نہیں۔ رہنے دو۔ یہ سردیاں اسی کمبل میں گزار لوں گا۔ اگلے سال دیکھا جائے گا"

**جامع مسجد دہلی اور حضور نظام:۔** یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ چوبدار نے مولوی سید احمد صاحب امام جامع مسجد دہلی کی آمد کی خبر دی۔ امام صاحب تشریف لے آئے اور دوران گفتگو حضور نظام سے کہا کہ دہلی کی جامع مسجد کے صحن کا چوتھائی فرش ادھڑ گیا ہے جس کی مرمت کے لئے چار لاکھ روپیہ درکار ہے اور وہ اسی غرض سے حاضر ہوتے ہیں کہ سرکار اس کی مرمت کروا دیں۔ اعلیحضرت حضور نظام نے اس کی مرمت سے متعلق تفصیلات دریافت کیں اور کچھ دیر بعد فرمایا کہ پاؤ حصّہ صحن کی مرمت کرنا ایسا ہی ہوگا جیسے مخمل میں ٹاٹ کا پیوند لگا دیا گیا ہو۔ انہوں نے حکم دیا کہ پورے صحن کا فرش اکھاڑ کر از سر نو فرش کیا جائے۔ اس حکم کے ساتھ ہی فرمان جاری کر دیا کہ سولہ لاکھ روپے اس مد میں خرچ کئے جائیں۔

اللہ اللہ کیسی قلندری اور کیسی خدا ترسی۔ اپنے لئے سولہ روپے کا کمبل نہیں خریدا لیکن خدا کے گھر کے لئے سولہ لاکھ روپے دیدیئے، کاش تاریخ ایسی کوئی مثال پیش کر سکے۔

## بادشاہی مسجد لاہور:۔

سر سکندر حیات کے دور میں بادشاہی مسجد لاہور کی فوری مرمت کے لئے ۲۰ لاکھ روپے کی ضرورت تھی۔ حکومتِ پنجاب نے اس رقم کی فراہمی کے لئے اراضی کے محصول میں ایک پیسہ کا اضافہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ حضور نظام کو جب اس بات کا علم ہوا تو انھوں نے دس لاکھ روپیہ حکومت پنجاب کو مسجد کی مرمت کے سلسلہ میں مرحمت فرمایا۔

## خلفاء کا احترام:۔

سنہ ۱۹۳۶ء میں دہلی تشریف لے گئے تھے۔ خواجہ حسن نظامی نے اپنے مکان پر مجلسِ سماع کا انتظام کیا اتفاق سے یہ مجلس حضرت عثمانِ غنیؓ کے یومِ شہادت کے دن واقع ہو رہی تھی۔ اعلیٰحضرت نے ایک مکتوب کے ذریعہ فرمایا۔

حسن نظامی صاحب

بعد نماز جمعہ ۱۸ ذی الحجہ کو جو قوالی کی شرکت کی دعوت دی ہے تو اس کے متعلق مجھے یہ کہنا ہے کہ اس دن خلیفہ سومؓ کی شہادت بھی واقع ہوئی ہے جسکا ہم کو (یعنی اہل تسنن کو) احترام کرنا ہے جو کہ داماد صحابی جلیل رسول تھے۔ اس لئے

آئندہ جمعہ ۲۰ مارچ کو اگر یہ مقرر ہوتی تو میں (درگاہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ) کی زیارت سے فارغ ہو کر (بعد نماز جمعہ) اس میں خوشی سے شرکت کرتا۔ اس لئے ارادہ ہے کہ آئندہ جمعہ کو جامع مسجد میں نماز ادا کروں۔ بہ ہر حال ہمارا یہ فرض ہے کہ جس کی جیسی کچھ منزلت ہے اس کا صحیح معنوں میں اعتراف کریں۔ مجھے امید ہے کہ میرا منشاء صاف ظاہر ہوئیگا۔

فقط (ع)

(اعلحضرت اپنے نام کا پہلا حرف تحریر فرمایا کرتے تھے)

## ایک اور مثال :-

حرمین شریف میں برقی روشنی کے اخراجات کے سلسلے میں ایک وفد حضور نظام کے پاس آیا اور امداد کی درخواست کی۔ حضور نظام لفظ "امداد" پر سخت چراغ پا ہوئے اور فرمایا کہ ان نیک کاموں کے لئے امداد کا لفظ موزوں نہیں ہے۔ انہوں نے کہا کہ اس سلسلے میں کسی سے کچھ نہ لیا جائے اور برقی روشنی کے سارے اخراجات صرفخاص سے ادا کئے جائیں۔

## مشرقی روایات سے عشق :-

حضور نظام کو مشرقی روایات سے عشق تھا۔ اس مشینی دور

میں جبکہ مشین مزدوروں جگہ لے رہی تھی اور مغربی ایجادات نے ایک تہلکہ مچا رکھا تھا۔ مغربی تہذیب اور مغربی طرزِ تعمیر کو اپنایا جا رہا تھا۔ حضور نظام کو مغربی تہذیب سخت ناپسند تھی۔ ان کو مشرق، مشرقی روایات، مشرقی صنعت اور مزدور سے کتنا لگاؤ تھا اس کا ثبوت اس واقعہ سے ملتا ہے کہ:-

وائسرائے کی آمد کے سلسلے میں انتظامات کئے جا رہے تھے۔ حضور نظام کے چھوٹے شہزادے معظم جاہ، وائسرائے کے اعزاز میں اپنے قصر میں دعوت دینے والے تھے۔ حضور نظام معظم جاہ کے قصر کے معائنے کے لئے گئے۔ شہزادے کے قصر کا ڈرائنگ روم فرانسیسی انجینیروں نے تعمیر کیا تھا جس کا فرش بلور کی اینٹوں سے بنایا گیا تھا اور اس کے نیچے برقی روشنی کا انتظام کیا گیا تھا۔ برقی روشنی میں فرش قالین نما ڈیزائن معلوم ہوتا تھا۔ حضور نظام نے اس کو سخت ناپسند فرمایا اور کہا کہ "قالین ہماری مشرقی صنعت ہے۔ اس سے اہلِ مشرق کو روزی ملتی ہے اس کی جگہ ایسی چیزیں غیر ملک کے لوگوں کے فائدے کا سبب بنتی ہیں۔"

معائنہ کے دوران شہزادی نیلوفر کے حمام میں گئے جس کی زمین اور دیواریں بلجیم کے آئینوں سے بنائی گئی تھیں تو ازراہِ

طنز فرمایا کہ "ہر طرف میرا عکس نظر آرہا ہے۔ اتنا پیسہ ضائع کرنے کا حاصل؟ وہاں لگے ہوئے مختلف فواروں اور بجلی کے آلات پر اعتراض کیا اور فرمایا کہ "آدمی مشینوں کا قیدی ہوتا جارہا ہے۔"

## دربارِ شاہی :۔

ڈیڑھ کروڑ رعایا کا بادشاہ اور ہندوستان کی سب سے بڑی ریاست کے تاجدار کے دربار کا یہ عالم ہے کہ نہ جھوٹا تکلف ہے اور نہ بے جا کروفر، تمکنت اور غرور چھو کر نہیں گیا۔ نہ تو کوئی نقیب ہے کہ جو آواز لگائے کہ "باادب باملاحظہ ہوشیار۔" سادگی میں بھی ایک رعب تھا دبدبہ تھا اور بقول خواجہ حسن نظامی صاحب، "عظمتِ خداداد کا یہ عالم ہے کہ بڑے بڑے قوی دل لوگ رعبِ شاہی سے مرعوب ہو جاتے ہیں، جب وہ باریاب ہوئے تھے تو انھوں نے دیکھا کہ بادشاہ سلامت جہاں تشریف رکھتے ہیں یعنی ایوانِ شاہی میں مختصر سا ایک حجرہ جس میں سادہ فرش کیا ہوا اور معمولی کرسیاں رکھی ہوئی ہیں نہ وہاں میز ہے اور نہ کوئی اور سامانِ آرائش۔ سب کو، کیا چھوٹا کیا بڑا، کیا اپنا کیا پرایا اسی مقام پر شرفِ باریابی بخشا جاتا ہے۔ قرونِ اولیٰ کی سادگی در و دیوار سے ظاہر ہوتی تھی۔ تاجدار نہ گرمی میں کسی پہاڑ پر جاتا ہے اور نہ طاعون

کے زمانہ میں گھر سے بھاگتا ہے اور نہ اسکو کسی وقت کام کے سوا عیش و آرام کا خیال آتا ہے مشرق کے بادشاہوں میں ان سے زیادہ عاقل، ان سے زیادہ مدبّر، ان سے زیادہ کام کرنے والا، ان سے زیادہ جفاکش، ان سے زیادہ سادگی کی زندگی بسر کرنے والا ایک بادشاہ بھی نہیں ہے۔"

## خوردن برائے زیستن و ذکر کردن :-

## جوار کی روٹیاں اور ارھر کی دال -

حاجی جنرل نواب عبیداللہ خاں مرحوم (بیگم صاحبہ بھوپال کے منجھلے صاجزادے) کے بڑے بیٹے صاجزادہ نواب سعیدالظفرخاں کی شادی حضور نظام کے توسط سے نواب صاحب سادا نور کی صاجزادی کے ساتھ ہوئی تھی. شادی کے بعد حضور نظام نے انہیں ہیرے کی انگوٹھی تحفے میں دی اور شادی کے اعزاز میں ایک عشائیہ ترتیب دیا اور کہا کہ دعوت میں پہنچ جانا۔ میں خود تو نہ جا سکوں گا. گھر ہی میں کھالوں گا۔"

سعیدالظفرخاں نے اصرار کیا کہ تایا جان (سعید صاحب کے والد حضور نظام کو بڑا بھائی کہا کرتے تھے) میں نہیں جاؤں گا. اور آپ کے ساتھ کھاؤں گا۔

حضور نظام نے مسکراتے ہوئے کہا کہ خیر! میرے ساتھ بھی کھالینا لیکن دعوت میں ضرور پہنچنا تمہارے اعزاز میں دی گئی ہے۔

شام کو سعید الظفر خاں صاحب کنگ کوٹھی پہنچے۔ایک سادہ دسترخوان بچھایا گیا۔ ملازمہ ایک کشتی میں ایک پیالہ ارہر کی دال اور دو روٹیاں جوار کی لائی حضور نظام نے سعید میاں سے کہا کہ "بسم اللہ" نظام نے پہل کی۔ سعید میاں بمشکل دو چار لقمے پانی کی مدد سے حلق کے نیچے اتار سکے۔ نظام نے مسکرا تے ہوئے کہا بس۔اب جلدی چلے جاؤ۔تمہارا انتظار ہو رہا ہوگا۔ جس وقت صاحبزادہ صاحب دعوت گاہ پہنچے تو تمام عمارت بقعۂ نور بنی ہوئی تھی۔باہر ایک ہزار سے زیادہ کاریں جن میں متعدد رولس رائس بھی تھیں۔کھڑی تھیں۔ جاگیرداروں، روسا اور عمائدینِ سلطنت نے سعید میاں کا استقبال کیا۔ دعوت میں ہر شخص کے روبرو سترہ یا اٹھارہ قسم کے الوانِ نعمت چنے گئے تھے۔

ایک بادشاہ کی غذا۔جوار کی دو روٹیاں اور ارہر کی دال خلفاء کی پیروی کی لاثانی مثال۔

## ملکہ عالیہ :۔

صاجزادہ سعید الظفر خاں کی والدہ نے بادشاہ بیگم ملاقات کے لئے کنگ کوٹھی پہنچیں ۔ان کے ساتھ پولیٹکل ایجنٹ کی میم صاحبہ بھی تھیں ۔حرم سرا میں خواصوں نے استقبال کیا ۔ایک ہال میں بیش قیمت گذار قالین ہر جگہ بچھے تھے۔ وہاں خواصوں نے آگے جانے کا اشارہ کیا ۔خواصیں زرق برق پوشاکیں پہنے، جواہرات سے مرصع زیورات پہنے ہوئے تھیں۔ بعض نے بالوں میں سچّے موتی پروئے ہوئے تھیں۔ کئی دالان اور کئی کمروں سے گزرنے کے بعد ایک صحن میں لکڑی کا ٹوٹا سا تخت بچھا تھا جس کا ایک پایہ نہیں تھا اور اینٹوں سے اس پائے کی جگہ سہارا دیا گیا تھا ۔اس پر کھجور کا بوریہ بچھا تھا ۔ایک دبلی سانولی رنگ کی خاتون تھیں جن کے ہاتھوں میں معمولی ہری کانچ کی چوڑیاں تھیں ۔لال طوس کا لمبا کرتا، لال دوپٹہ، سوسی کی ازار پہنے تھیں۔ صاجزادہ سعید الظفر خاں کی والدہ نے پوچھنا چاہا کہ بادشاہ بیگم کہاں ہیں؟

پولیٹکل ایجنٹ کی بیگم نے ہاتھ دبا کر کان میں کہا کہ " یہ ہیں بادشاہ بیگم" یہ تھیں فقیر منش بادشاہ کی ملکہ جو خود بھی سادگی کی ایک اعلیٰ مثال تھیں۔

آخر وقت میں بادشاہ بیگم جن کو "دلہن پاشاہ" کہا جاتا تھا دماغی توازن کھو بیٹھی تھیں ۔ چنانچہ جب بھی دورہ پڑتا تو حضور نظام کے پاس پہنچ جاتیں اور انھیں بے دریغ صلواتیں سناتیں کوئی اور بادشاہ ہوتا تو اس گستاخی کی عبرت ناک سزا دیتا لیکن حضور نظام سنکر چپ ہو جاتے۔ ان پر کسی قسم کی کوئی پابندی تھیں ۔ اکثر وہ شاہی موٹر میں ہوا خوری کرتی ہوئی شہر میں نکل آتیں اور دوکانوں سے بے شمار اشیاء اپنے ساتھ لے جاتیں ۔ حضور نظام کے احکامات تھے کہ ایسی اشیاء کی فہرست بنائی جاتے اور بعد کو دوکانداروں کو اشیاء واپس کردی جائیں ۔ جو اشیاء ٹوٹ پھوٹ جاتیں تو ان کی قیمت ادا کردی جاتی ۔ بارہا ایسا ہوا کہ حضور نظام کی سواری نکلتی اور ادھر دلہن پاشاہ بھی سیر کو نکلتیں حضور نظام ان کی موٹر دیکھ کر اپنی موٹر کو پیچھے کروالیتے۔

## ایک بادشاہ کا معمول :۔

رات کا پچھلا پہر ہے ۔ ہر طرف سناٹے کا عالم ہے ۔ سارا ملک خواب شیریں کے مزے لوٹ رہا ہے ۔ گھنٹوں کی آواز رات کے سکوت کو توڑتی ہے ۔ رات کے چار بجے ہیں گھنٹوں کی آواز سن کر ایک بادشاہ جاگ اٹھتا ہے ۔ اپنے کمرے سے باہر آتا ہے ۔ اپنی پرانی ۲۸ء کے ماڈل فورڈ کار میں خود پٹرول بھرتا ہے ۔ ابھی خدام

سو رہے ہیں۔ کار کا ڈرائیور خوابِ غفلت میں ہے۔ موٹر اسٹارٹ ہونے کی آواز سن کر گھبرا کر اٹھ جاتا ہے۔ دیکھتا ہے کہ بادشاہ سلامت بہ نفسِ نفیس موٹر نکال رہے ہیں۔ کار مزارات و مقابر تک جاتی ہے۔ وہاں اعلیٰ حضرت دوزانو بیٹھ جاتے ہیں۔ وہیں کھلے میدان میں تاجدارِ دکن، دو عالم کے شہنشاہ کے حضور سر بسجود ہو جاتے ہیں۔ نماز سے فارغ ہو کر بادشاہ سلامت کنگ کوٹھی واپس ہو جاتے ہیں۔

دن نکل چکا ہے۔ دنیا کے کاروبار شروع ہو چکے ہیں۔ اعلیٰ حضرت کاروبارِ مملکت میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ دس بجے تک خدا مان بارگاہ کو شرفِ باریابی عطا ہوتا ہے۔ اس کے بعد ریاست کی گتھیاں سلجھائی جاتی ہیں۔ شام کے ۵ بجے تک جو کاغذات پیش ہوتے ہیں وہ آج کے کل پر نہیں رکھے جاتے بلکہ اسی وقت تجاویز صادر کر دی جاتی ہیں۔

۵ بجے کے بعد سواری مبارک علیا حضرت والدہ معظمہ کے قصر کی طرف روانہ ہو جاتی ہے اعلیحضرت کو اپنی والدہ ماجدہ سے بے انتہا محبت تھی۔ وہ ان کا بے حد احترام کرتے تھے۔ روزآنہ بلا ناغہ ہر موسم میں ٹھیک ۵ بجے وہ اپنی والدہ سے ملنے جاتے تھے۔

شاید ہی اس معمول میں فرق آیا ہو۔

سواری شاہانہ شہر کی سڑکوں سے گزرتی ہے نہ کوئی جلوس ہوتا ہے اور نہ کوئی کرّو فر۔ عوام کی تکلیف کا اتنا احساس تھا کہ ان کی سواری باہر نکلتی تو فقط چند لمحات کے لئے ٹریفک بند ہوتی تھی۔ ان کے حکم سے پولیس نے یہ انتظام کر رکھا تھا کہ جب موٹر محل کے دروازے پر آتی تو پہلی سیٹی ہوتی جو محل سے اس جگہ تک مسلسل یکے بعد دیگرے پولیس والے بجاتے جہاں ان کو جانا ہوتا۔ پھر جب وہ محل سے برآمد ہوتے تو دوسری سیٹی ہوتی اور جب ان کی موٹر چلتی تو تیسری سیٹی ہوتی۔ اس کے ساتھ ہی تھوڑی دور تک راستہ بند کر دیا جاتا اور موٹر گزرتے ہی کھول دیا جاتا تھا۔

## اخلاقِ سلطانی :-

اعلیٰ حضرت کے سینے میں ایک جابر و ظالم کا دل نہیں تھا بلکہ ایک انسان کا دل تھا۔ ان میں انسانی ہمدردی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ وہ کسی کا دھوپ میں کھڑا رہنا گوارا نہیں فرماتے تھے۔ برسات میں کسی کے بھیگ جانے سے انھیں تکلیف ہوتی تھی۔ ملازمین میں سے اگر کوئی بیمار ہوتا تو اسے فوراً آرام لینے کا حکم صادر فرماتے

تھے. خدمت گزاروں کے ہجوم کے ہوتے ہوتے سلطانِ دکن اپنی معمولی ضرورتوں کی تکمیل خود فرماتے تھے. کاغذات کی رسید خود تحریر کرتے یہاں تک کہ لفافوں کو گوند سے خود بند فرماتے، بار بار کرسی سے اٹھنے کی زحمت کا ذرا بھی خیال نہیں فرمایا جاتا تھا. پاکیزگی اور طہارت کا اس درجہ لحاظ کرتے کہ ہاتھ بار بار دھوئے جاتے تھے.

اولاد کی تمام ضرورتیں، محلات کی تمام خواہشیں، راحت و آرام کا خیال، غذا کی فراہمی، دوا کا انتظام غرض ہر بات سے باخبر رہتے تھے. چھوٹوں کا لحاظ اور بڑوں کا احترام اس طرح کیا جاتا کہ اسلامی آداب کی شائستگی تاریخ کے اوراق میں بے چین نظر آتی ہے.

## ماں کا احترام:۔

والدہ معظمہ کے ادب و لحاظ میں خسروِ دکن ایک مسلمان سعادت مند بیٹے کے سادہ لباس میں جلوہ گر رہتے تھے. جب والدہ معظمہ کا سامنا ہوتا تھا تو ناممکن تھا کہ ان سے سبقت کرنے کی جسارت فرماسکیں۔

## مذہب کا احترام:۔

کبھی پاؤں پر پاؤں رکھ کر مذہبی تذکرہ نہیں فرمایا جاتا تھا۔ اسمائے محمودہ اور اسمائے حسنی اس وقت زبان پر نہیں لاتے تھے

جب سگریٹ نوش فرمایا جارہا ہوتا۔ مذہب کا شیدائی بادشاہ ہمیشہ ان موقعوں پر مودب ہو جاتا تھا جب بزرگانِ دین کے اسمائے مبارک زبان پر ہوتے یا خدا اور رسول کا تذکرہ کیا جاتا ہو۔

## اولیاء اللہ سے عقیدت:۔

دکن اس اعتبار سے بھی خوش بخت رہا ہے کہ اس کو اولیاء اللہ کی ابدی آرام گاہ بننا نصیب ہوا۔ شہر حیدرآباد کے علاوہ دکن کے بیشتر اضلاع میں اولیاء اللہ کی آخری خواب گاہیں ہیں۔

حضور نظام کو ان اولیاء اللہ اور بزرگانِ دین سے بے پناہ عقیدت تھی۔ سالانہ عرس کے موقعہ پر آپ کی بیش بہا امداد سے رونق دو دوبالا ہو جاتی تھی۔ حضور نظام بہ نفسِ نفیس شرکت فرماتے۔ حیدرآباد سے دور گلبرگہ شریف میں حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ کے عرس میں شرکت کرتے آپ دہلی میں حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ اور اجمیر میں غریب نواز حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے مزارات کی زیارت فرما چکے ہیں۔

## اورنگ زیب عالمگیرؒ کے مزار پر نظام دکن کی حاضری:۔

نواب مشتاق احمد خاں سابق ایجنٹ جنرل حیدرآباد دکن نے اپنی کتاب "حیاتِ فخر" میں ایک واقعہ بیان کیا ہے جو اپنی نوعیت

کے اعتبار سے خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔

حضرت اورنگ زیب عالمگیرؒ موضع خلد آباد ضلع اورنگ آباد میں ایک اونچی جگہ ایک احاطہ کے اندر دفن ہیں۔ اس کے مزار کے قریب سیڑھیوں سے ذرا نیچے آصف جاہی خاندان کے مورثِ اعلیٰ نظام الملک آصف جاہ اوّل دفن ہیں۔ آصف جاہی خاندان کو اورنگ زیب عالم گیرؒ کی ذات سے والہانہ عقیدت رہی ہے چنانچہ اس خاندان کا سربراہ کوئی بھی ہو جب کبھی وہ عالم گیرؒ کے مزار پر حاضری دیتا تھا تو اس موقعہ پر مغلیہ دربار کے پورے آداب ملحوظ رکھے جاتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ میں نے اپنی آنکھوں سے جو منظر دیکھا اس سے مسلمانوں کی گذری ہوئی شان و شوکت کا خیال کر کے طبیعت بہت متاثر ہوئی۔

اعلیٰ حضرت میر عثمان علی خاں اپنے درباریوں اور عمائدین سلطنت کے ساتھ درباری لباس میں فاتحہ کے لئے تشریف لائے۔ مقبرہ کے دروازے پر آکر رک گئے۔ اس پر شاہی چوبدار نے جو مغلیہ دربار کے مخصوص لباس میں ملبوس تھا۔ اور اورنگ زیب عالمگیرؒ کے مزار کی پائنتی کھڑا تھا۔ باآوازِ بلند شاہی القاب پڑھنے شروع کئے "محی الملّت والدین اورنگ زیب عالمگیر

بادشاہ" وغیرہ وغیرہ شاہی القاب ختم ہونے کے بعد والیٔ دکن کی حاضری کی "میر عثمان علی خاں صوبہ دار دکن حاضر ہے" کے الفاظ میں اجازت طلب کی۔ اجازت نامہ کے الفاظ سن کر اعلیٰ حضرت ذرا سے توقف کے بعد اپنے سارے درباریوں کے ساتھ ایک جلوس میں آگے بڑھے۔ جب مزار کے قریب پہنچے تو خاص حیدرآبادی طریقہ سے جھک کر تسلیمات بجالائے۔ اس کے بعد فاتحہ پڑھی اور الٹے پاؤں واپس ہوئے۔

## اسلامی مساوات اور سیرت عثمانی :-

۱۔ پہلے بادشاہوں کا دستور تھا کہ جب وہ نماز کے لئے مسجد میں آتے تو تمام لوگ تعظیم کے لئے اٹھ کھڑے ہو جاتے تھے۔ اعلیٰ حضرت نے اس دستور کو مٹا دیا کہ یہ خدا کا دربار ہے۔ یہاں بادشاہ اور فقیر سب برابر ہیں۔ جب سے مسجد میں اعلحضرت کی تشریف آوری پر تعظیم کی اجازت نہیں تھی۔

۲۔ ایک مرتبہ خسرو دکن میلاد کی مجلس میں تشریف لائے۔ ایک ملازم خاص جو وہاں موجود تھے آپ کو آتا دیکھ کر فوراً "بگلوس (پٹہ) کمر سے باندھ لیا۔ جوں ہی آپ کی نظر پڑی دریافت فرمایا کہ "تم نے یہ کیوں باندھا ہے"۔ ملازمِ خاص نے عرض کی کہ "حضور

تشریف فرما ہیں" اس وقت اعلحضرت نے فرمایا کہ "یہ میرا دربار ہے یا رسول اللہ ؐ کا"۔ اسی وقت ملازم نے بگلوس اتار دیا۔

۳ ۔ ایک مرتبہ آصف سابع نے ایک مجلس وعظ میں شرکت کی واعظ نے دورانِ وعظ آپ کو دیکھ کر سلام کیا۔ حضور نظام نے فرمایا۔ مولوی صاحب افسوس ہے کہ آپ وعظ فرما رہے ہیں یا سلام کر رہے ہیں۔ میں داخل ہوا ہوں مجھ پر سلام واجب تھا نہ کہ آپ پر۔ ممبر رسول اللہ پر تشریف رکھتے ہوئے آپ کو مجھ جیسے دنیا دار کی تعظیم ضروری نہ تھی۔ اس جلسہ میں جس قدر مسلمان آرہے ہیں کیا آپ سب کو سلام کر رہے ہیں۔

۴۔ ۱۳۵۴ھ میں اعلحضرت نے دہلی کا سفر کیا۔ درگاہِ حضرت نظام الدین محبوب الہٰیؒ کی زیارت کے بعد نماز جمعہ کے لئے مسجد میں تشریف لائے تو ایک صاحب نے قصیدہ سنانا چاہا تو حضور نظام نے ارشاد کیا مسجد میں بندہ کی عظمت کبھی بیان نہیں ہونی چاہئے۔ خانۂ خدا میں شاہ و گدا سب ایک ہیں یہاں کوئی چھوٹا اور بڑا نہیں ہے" اور پھر یہ کہہ کر عقیدتمند کی تسکین بھی فرمادی کہ "البتہ مسجد کے باہر کچھ ہو تو مضائقہ نہیں ہے۔"

۵ ۔ ۱۳۵۴ھ ہی میں حضور پر نور گلبرگہ شریف میں حضرت خواجہ

بندہ نواز گیسو دراز رحؒ کے عرس میں صندل شریف کے جلوس کے ساتھ پا پیادہ تشریف لائے۔ اسوقت سیڑھیوں کے پاس گارڈ آف آنرز کی سلامی کا انتظام تھا لیکن اعلیٰحضرت نے یہ فرماتے ہوئے کہ "ہم خود یہاں سلام کو آئے ہیں۔ سلامی کی ضرورت نہیں" سلامی کی ممانعت فرمادی۔

یہ عجیب بادشاہ تھا۔ جس کی کسر نفسی نے کتنی عجیب روایات قائم کیں۔ اسلامی روایات کی اتنی شدت سے پابندی کہ جس کی ایک مثال قائم ہو جائے ہمیں دوسرے بادشاہوں میں نہیں ملتی۔

## حضور نظام کا ذوقِ قرآن :۔

حاکمِ دکن جب حاکموں کے حاکم اور سب بادشاہوں کے بادشاہ، عزت وجلال والے خدا کا باعظمت کلام سنتے تو چہرہ کی رنگت کا اتار چڑھاؤ اور عالمِ وجد میں بار بار سبحان اللہ کہتا اور زانو پر وجدانی حالت میں ہاتھ پہ ہاتھ مارنا بڑا ہی رقت انگیز سماں ہوتا تھا۔

قاری صاحب جس وقت کلام پاک کے بڑے بڑے سورے اور آیات کی تلاوت کرتے تو اعلیٰحضرت والہانہ شیفتگی کے عالم

میں غیر ادا شدہ جملوں اور آیت کے ٹکڑوں کو قاری سے پہلے ہی تقدیماً بے ساختہ خود فرما دیتے تھے جس سے ان کے حفظِ کلام پاک کا بھی بخوبی اندازہ ہوتا ہے سرکاری کاروبار میں اکثر افتتاح وغیرہ کی شاہی رسم کے موقع پر پہلے ہی سے وہاں قاری کے حاضر ہونے کا حکم دیتے اور ہر کام کا آغاز اللہ کے کلام سے کرتے۔

اعلحضرت کو خوش الحان قاریوں سے تلاوتِ کلام پاک سننے کا بے انتہا شوق تھا۔ ایک مرتبہ عید کی نماز کے موقعہ پر خطبہ کے بعد لوگ ملکر رخصت ہونے لگے مگر اعلحضرت بیٹھے رہے۔ قاری ابراہیم حجازی کی زبان سے کلام الٰہی سنتے رہے۔

## جذبۂ رفاقت:۔

آصفِ سابع کی ایک اور صفت اُن کا جذبہ رفاقت تھا۔ روز نئے دوست بدلنا ان کی فطرت نہیں تھی۔ حتیٰ کہ وہ اپنی استعمال میں آنے والی چیزوں کو بھی اپنے سے جدا کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔

حضور نظام کے پاس ایک چھڑی ہوا کرتی تھی۔ کثرتِ استعمال سے اس میں شگاف پڑگیا تھا۔ انہوں نے اس پر چاندی کا تار بندھوا کر دوبارہ استعمال کرنا شروع کر دیا۔ شہزادوں نے نہایت قیمتی چھڑیاں بھوائیں۔ نظام نے شہزادوں سے کہلوایا کہ یہ چھڑی بیس سال سے

ہمیری رفیق ہے اور تھوڑی سی مرمت کے بعد پھر استعمال کے قابل ہو گئی ہے۔ یہ بات تم جیسے نوجوانوں کی سمجھ میں کیا آسکتی ہے۔ جو روز دوست اور رفیق بدلا کرتے ہیں۔

## قاتل کے ساتھ سلوک :۔

حضور نظام کا دستور تھا کہ وہ روزانہ معمول کے مطابق شام میں اپنی والدہ سے ملنے جاتے تھے۔ ان کی سواری کے ساتھ انکی حفاظت کے لئے کوئی دستہ نہیں ہوا کرتا تھا۔ انہوں نے اپنی حفاظت کے لئے سیکیورٹی پولیس کا بھی انتظام نہیں کیا تھا سوائے ایک ناخوشگوار واقعہ کے کوئی واقعہ ایسا پیش نہیں آیا جبکہ ان پر کوئی حملہ کیا گیا ہو۔ اسٹیٹ کانگرس کے اشارہ پر ایک آریہ سماجی نے ان کی کوٹھی کے قریب حضور نظام کی موٹر پر دستی بم پھینکا جو نشانہ پر نہ لگا۔ تھوڑے ہی فاصلہ پر حضور نظام نے گاڑی رکوادی۔ اس اثناء میں مجرم پکڑا جا چکا تھا اور لوگ بپھرے ہوئے تھے کہ اس کی تکا بوٹی کر ڈالیں لیکن حضور نظام پلٹ آئے اور اس کو عوام کے ہاتھوں سے بچایا اور پولیس کے حوالے کر دیا۔ معمول کے مطابق شاہی سواری روانہ ہو گئی اور اس کے بعد بھی معمول میں کوئی فرق نہیں آیا۔

## جمعہ کی نماز :۔

حضور دکن کا یہ دستور تھا کہ وہ جمعہ کی نماز باغِ عامہ (پبلک گارڈن) کی مسجد میں ادا کرتے تھے۔ اس مسجد میں عوام کا بھی داخلہ ہوتا تھا اور کوئی روک ٹوک نہیں تھی۔ یہ کہنا سراسر جھوٹ ہے کہ حضور کے ساتھ ان کی صاحبزادیاں بھی ہوا کرتی تھیں۔

راقم الحروف نے جب اس کے متعلق نواب حسن یار جنگ بہادر سے پوچھا تو انھوں نے فرمایا کہ یہ جھوٹ ہے کہ حضورِ نظام کے ساتھ صاحبزادیاں بھی نماز کے لئے مسجد میں آتی تھیں۔ ہم کو بہ حیثیت شاہی خاندان کے افراد کے ہدایت ہوتی کہ جمعہ کے روز نماز میں ضرور شریک رہیں۔ یہ کہنا بھی غلط ہے کہ عوام آنکھ کھجانے کے بہانے شہزادیوں کو گھورا کرتے تھے اس لئے اعلحضرت نے دونوں ہاتھوں سے آنکھیں کھجانے کا حکم دیا تھا۔ جمعہ کی نماز میں اور پھر شہزادیوں کو گھورنا عوام پر بہتان لگانا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ آنکھیں دونوں ہاتھوں سے کھجائی جاتی تھیں اسکی وجہ توہم پرستی ہے۔ دکن کے لوگ ایک ہاتھ سے آنکھیں نہیں ملتے بلکہ دونوں ہاتھ استعمال کرتے ہیں۔

## ہندو، اور خسرو دکن:۔

اعلحضرت ایک رواداد بادشاہ تھے۔ انھوں نے مسلمانوں کے ساتھ جس طرح کا سلوک کیا اس سے بہتر سلوک ہندوؤں کے ساتھ روا رکھا چنانچہ ہندوؤں کی جاتزا، مندروں اور مذہبی اداروں کو جو امداد دی جاتی تھی اتنی امداد مسلمانوں کے اداروں کو بھی نہیں ملتی تھی۔ حضور نظام کہا کرتے تھے کہ ہندو اور مسلمان میری دو آنکھیں ہیں۔ ان کے رفاہِ عام کے کاموں اور رواداری کے باعث ہندو حضور نظام کی پوجا کرتے تھے۔ ہندوؤں کے گھروں میں نظام دکن کی تصویر ہوا کرتی تھی اور وہ اس تصویر پر پھول چڑھاتے اور صبح و شام اس کی پوجا کیا کرتے تھے۔ یہ عمل نہ صرف ان کی بادشاہی کے دور میں ہوا کرتا تھا بلکہ حیدرآباد کے زوال کے بعد بھی ہندو ان کے دور کو یاد کر کے رویا کرتے تھے۔

۱۹۶۲ء میں راقم الحروف کو دکن جانے کا اتفاق ہوا اور صرف دو دنوں کے لئے اورنگ آباد بھی جانا ہوا۔ کسی کام کے سلسلے میں اجنٹہ سے بھی ۲۵ میل دور ایک دیہات میں گزر ہوا تو اس دیہات کے پیٹل نے ہماری دعوت کی۔ اس کے گھر میں حضور نظام، ان کے اجداد اور سالار جنگ کی تصویریں لگی ہوئی

تھیں۔ جب میں نے اس سے پوچھا کہ اب ان تصویروں کی کیا ضرورت ہے؟ میرا یہ بے تکا سوال اس ہندو پٹیل کو سخت ناگوار گزرا اور اس نے کہا کہ میاں آپ لوگ کیا جانیں کہ یہ لوگ کیا تھے۔ ایسے بادشاہ اور ایسے امیر اب کبھی پیدا نہیں ہوں گے۔ آج کے لوگ حکومت کرنا کیا جانیں"۔ اس کے بعد اس پٹیل نے ان کے کارنامے بیان کرنے شروع کر دیے تو دو گھنٹے گزر گئے اور وقت کے گزرنے کا احساس بھی نہیں ہوا۔"

اسی قسم کا ایک واقعہ مجھے اپنے ایک بھائی احمد قدوائی صاحب نے سنایا۔ صاحبِ موصوف اس دن حیدرآباد ہی میں تھے جس دن حضور نظام کا انتقال ہوا تھا۔ حضور نظام کے انتقال کی خبر سن کر مجمع اکٹھا ہو گیا۔ اسی مجمع میں سے دو نوجوان ہندو لڑکوں نے کہا کہ اچھا ہوا۔ اب ان کی دولت ہماری حکومت کو مل جائے گی۔" نوجوانوں کا یہ جملہ قریب کھڑی ہوئی ہندو عورتوں نے سنا۔ ان میں ایک بوڑھی عورت بھی تھی۔ جب اس نے یہ جملہ سنا تو وہ آگ بگولا ہو گئی اور ان نوجوانوں کے پیچھے پنجے جھاڑ کر پڑ گئی اور کہا کہ تیرے جسم پر جو کپڑے نظر آتے ہیں وہ کس نے دئے ہیں۔ تو جو پڑھ لکھ چکا ہے یہ کس کا طفیل ہے۔" اس کے بعد اس بڑھیا نے رو رو کر حضور

نظام کے عہد کی ترقیوں کا حال بیان کیا اور ان نوجوانوں کو اس قدر صلواتیں سنائیں کہ ان کو وہاں سے بھاگ جانا پڑا۔

یہ بظاہر معمولی واقعہ ہے لیکن اس سے پتہ چلتا ہے کہ حضور نظام کی کیسی پرکشش شخصیت تھی۔ اور اس بڑھیا کا کیا ظرف اور کیا جذبہ وفاداری تھا۔

حضور نظام خود عالم تھے انہوں نے عالموں کی قدر کی۔ خود شاعر تھے اور شعراء کی سرپرستی کی وہ ایک بیدار مغز اور مردم شناس بادشاہ تھے۔ اقصائے ہند میں جہاں کہیں انہیں کوئی ایسا اہلِ فن نظر آیا جو زمانے کی ناقدری کا شکار ہو رہا ہو تو وہ اس کو حیدرآباد بلا لیتے اپنے سایۂ عاطفت میں تربیت دیتے۔ اور اس کے ہنر کی قدر کرتے ہندوستان کے ہر صوبے سے لوگ کشاں کشاں آتے۔ جن میں صلاحیت ہوتی وہ مقام پیدا کر لیتے۔ ایسے بھی لوگ آئے جو بزعم خود اعلیٰ صلاحیتوں کے مالک تھے لیکن جب جوہر شناس کی کسوٹی پر پورے نہ اترے اور انھیں وہ مقام حاصل نہ ہوا جس کی وہ خواہش کرتے تھے تو انھوں نے حضور نظام کو گالیاں بھی دیں لیکن اس کے باوجود اپنی عمر کا بیشتر حصہ حیدرآباد ہی میں گزارا اور وہاں انھیں قسمت سے کچھ زیادہ ہی ملا۔

حضور نظام بہت مردم شناس اور مزاج شناس تھے۔ انہوں نے کبھی کسی ذی عزت اور خود دار کی تضحیک نہیں کی۔ جو سازشی اور بدخواہ تھے انہوں نے اپنے کیے کی سزا پائی۔ بااصول، دیانتدار اور حق گو لوگوں کی حضور نظام نے ہمیشہ قدر کی ان کی رائے اور مشورہ کی نہ صرف قدر کی بلکہ اظہارِ خوشنودی بھی فرمایا۔

حیدرآباد میں جہاں اور صوبے کے لوگ تھے ان میں پنجاب کی دو شخصیتیں ایسی بھی تھیں

جنہوں نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ حیدرآباد میں گزارا اور اپنا حق نمک ادا کیا۔ ایک تو مولانا غلام قادر گرامی تھے اور دوسرے فخرالدین احمد خاں (نواب فخر یار جنگ)، جو حیدرآباد کے وزیر مالیات تھے۔

ان کی وزارت کے دوران ایسے واقعات پیش آئے جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضور نظام بااصول اور بہی خواہ لوگوں کی کس قدر قدر کرتے تھے اور

لہ نواب فخر یار جنگ مالیاتی امور میں حرفِ آخر ہونے کے

---

لہ نواب مشتاق احمد خاں سابق ایجنٹ جنرل حیدرآباد کی کتاب "حیاتِ فخر" سے اقتباسات۔

علاوہ ایک نہایت پاک طینت، دیانت دار، با اصول، با اخلاق، شائستگی کے عاشق خود دار اور فرشتہ سیرت سچے مسلمان تھے۔ انہوں نے اپنے اصول کو شخصیات، قرابت داری وغیرہ پر ہمیشہ ترجیح دی اور بڑی سے بڑی شخصیت کی ناراضی کی پرواہ بھی نہیں کی۔ انکی صائب رائیوں اور مشوروں نے حیدر آباد کی مالی حالت کو استحکام بخشا۔ ان کی دیانت داری کے باعث حاسدوں نے بار ہا سازشیں کیں لیکن حق و صداقت ہمیشہ غالب رہی ان کو بار ہا ایسے فیصلے کرنے پڑے کہ جو حضور نظام کی مرضی کے خلاف تھے لیکن انہوں نے ہمیشہ حق بات کہی اور حضور نظام نے ان کے فیصلوں پر ہمیشہ عمل کیا۔ یہ عجیب و غریب بات ہے کہ ایک مطلق العنان بادشاہ اور یوں اپنی وسعتِ قلبی اور روشن خیالی کا ثبوت دے۔ تاریخ میں ایسے بادشاہ شائد ہی گزرے ہوں۔

۱۔ ایک مرتبہ اعلیٰ حضرت نے جو محلہ کے لئے چند ہزار کا سامان خریدا۔ جب بل موصول ہوا تو عماد جنگ کوتوال نے سرکار کی خوشنودی اور نواب فخر یار جنگ کو زک دینے کے لئے اس کی ادائیگی دیوانی سے کروانی چاہی اور حضور سے بل کو صدر محاسب کے پاس ادائیگی کے لئے بھجوانے کا حکم حاصل کر لیا۔ فخر یار جنگ،

نے اس بل پر اعتراض کیا کہ محکمہ فنانس سے منظوری حاصل کی جائے۔ عماد جنگ اپنی سازش پر خوش ہو کر اعلیٰ حضرت کے سامنے نواب فخر یار جنگ کے اعتراض کو پیش کیا۔ اعلیٰ حضرت نے نواب فخر یار جنگ کے اس اعتراض کو مان لیا اور فرمایا کہ "یہ بل میں نے صدر محاسب صرفِ خاص کو بھیجنے کے لئے کہا تھا۔ اچھا ہوا فخرالدین نے اس کی ادائیگی نہیں کی ورنہ مجھے گلانسی سے شرمندہ ہونا پڑتا۔"

یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ حضور نظام نے حکومت اور عوامی خزانہ سے ایک پائی بھی نہیں حاصل کی۔ وہ اپنے اخراجات اپنی ذاتی جائداد "صرفِ خاص مبارک" سے پورے کیا کرتے تھے جس کی آمدنی ۳ کروڑ روپے سالانہ تھی۔

## ۲۔ پہلی مسلم بیمہ کمپنی اور حکومتِ حیدر آباد کی سرپرستی:۔

ہندوستان میں بیمہ کمپنیاں قائم ہو رہی تھیں۔ بعض مسلم اکابر کی خواہش تھی کہ ایک خالص مسلم بیمہ کمپنی قائم ہو۔ یہ کام بڑی امداد اور سرپرستی کا محتاج تھا۔ حیدر آباد پر سب کی نظریں لگی ہوئی تھیں۔ چنانچہ ایک وفد جو غلام محمد[1] صاحب، شعیب[2] قریشی صاحب اور عبدالرحمن صدیقی صاحب پر مشتمل تھا۔ حیدر آباد آیا۔

---

[1] گورنر جنرل پاکستان [2] روس میں پاکستان کے سفیر۔

[3] مسلم لیگ کے لیڈر جو کچھ عرصے کے لئے مشرقی پاکستان کے گورنر رہے

نواب فخر الملک بہادر کی مساعی جمیلہ سے حکومتِ حیدرآباد نے اپنی سرپرستی کا اعلان کیا۔ بہت کم لوگوں کو اس کا علم ہے کہ ایسٹرن فیڈرل انشورنس کمپنی اس طرح معرض وجود میں آئی۔

۳ - اعلحضرت کے دربار میں جی حضور کہنے والے مصاحبین کی کمی نہیں تھی جو خوشنودی کے لئے غلط رائے بھی دیتے تھے اور شب و روز سازشیں بھی کرتے تھے۔ یہی مصاحبین حضور نظام کی بدنامی کا باعث بھی ہوئے اور اکثر ذلیل و خوار بھی ہوئے۔ حضور ان خوشامدیوں سے خوب واقف تھے۔ اگر کوئی صائب الرائے حضور نظام کو کوئی مشورہ دیتا تو آپ اس مشورہ کو خواہ وہ مرضی کے خلاف ہوتا مگر قبول کر لیتے تھے۔

حضور نظام چاہتے تھے کہ اپنی ذاتی سرمایہ سے صنعتی کارخانہ قائم کریں تاکہ خود بھی آمدنی سے مستفید ہو سکیں۔ درباریوں میں کس کی مجال تھی کہ ایسے جاہ و جلال والے بادشاہ کی رائے کی مخالفت کرے۔ جب نواب فخر یار جنگ سے رائے لی گئی تو یہ بے باک حق پرست اور صائب الرائے شخصیت نے مشورہ دیا کہ "کسی کارخانہ یا صنعتی ادارہ میں منافع کی خاطر سرمایہ لگانا سرکار کے شایانِ شان نہیں ہے"۔ اعلیٰ حضرت کو یہ بات پسند آگئی اور فرمایا "سچ کہتے ہو۔"

ایسا اقدام میرے شاہی منزلت کے منافی ہے "

۴۔ دہلی میں نظام پیلس کی تعمیر مکمل ہو چکی تھی اور اس کے لئے فرنیچر اور آرائشی سامان کی فراہمی کے لئے حکومت نے ایک کثیر رقم منظور کی تھی۔ حضور نظام کی خواہش تھی کہ ساری رقم ان کو تفویض ہو جائے اور وہ اپنی صوابدید سے رقم خرچ کریں۔ حضور نے سب سے رائے لی جب نواب فخر یار جنگ سے رائے لی گئی تو انہوں نے سرکار کی رائے سے اختلاف کیا۔ سب کو یقین تھا کہ اس بیباکی کا خمیازہ بھگتنا پڑیگا۔ لیکن حضور نظام اسکو سن کر ذرا سوچ میں پڑ گئے اور معاملہ رفع دفع ہو گیا۔

## حضور نظام کی مردم شناسی :۔

سالگرہ مبارک اور عید وبقر عید کی تقاریب کے موقعوں پر بہت سے امراء اور عہدہ دار درباری لباس میں کنگ کوٹھی میں حاضری دیتے تھے۔ اعلیٰ حضرت تشریف لاکر کبھی کسی عہدہ دار سے مذاق کرتے تھے، کبھی کسی امیر پر فقرے چست کرتے تھے مگر اعلیٰ حضرت فرلس اور مردم شناس تھے وہ سمجھتے تھے کہ کون کتنے گہرے پانی میں ہے اور وہ جس کو اپنے مذاق کا تختۂ مشق بنانا چاہتے ہیں وہ اپنے ہمعصروں اور ساتھیوں کی موجودگی

میں اس ذلت کو سہار بھی لے گا یا نہیں. جب کسی کے متعلق ان کو یقین ہو جاتا تھا کہ وہ برداشت نہیں کریگا۔ اس سے اس قسم کا برتاؤ نہیں کرتے تھے. چنانچہ نواب فخر یار جنگ جیسے متمدّن اور خود دار عہدہ دار سے کسی موقعہ پر پبلک یا نجی حالات میں کوئی غیر سنجیدہ برتاؤ نہیں کیا. سر علی امام کو بھی کبھی کسی غیر سنجیدہ رویہ سے واسطہ نہیں پڑا۔

## اعلیٰ حضرت کا اپنی وطن کی روایات رسم و رواج اور مذہب سے عشق

نواب فخر یار جنگ بہادر کے صاحبزادے (مشتاق احمد خاں سابق ایجنٹ جنرل حیدر آباد دکن حال مقیم لاہور) ولایت سے تعلیم پاکر واپس آئے تو ان کے والدِ ماجد انھیں حضور نظام کی خدمت میں سلام کرانے کے لئے لے گئے حضور نے پوچھا "یہ تمہارا لڑکا ہے" نواب فخر یار جنگ نے جواب دیا "یہ غلام زادہ ہے. ولایت سے تعلیم پاکر آیا ہے اور سرکار کی قدم بوسی کے لئے اسے لایا ہوں"! اس پر اعلیٰ حضرت نے تعجب سے کہا "ولایت سے؟ کون سی تعلیم ہے جو یہاں حاصل نہیں ہو سکتی جو تم نے اسے ولایت بھیجا؟ ہمارے ملک کے نوجوان وہاں جاکر شترِ بے مہار کی طرح مارے مارے

پھرتے ہیں اور اپنے وطن کی روایات اور رسم و رواج اور سب سے بڑھ کر اپنے مذہب سے بے گانہ ہو جاتے ہیں۔

دورانِ گفتگو ان سے پوچھا "یہ کوئی چٹے کارنی تو اپنے ساتھ نہیں لایا؟" نواب صاحب نے فرمایا "نہیں سرکار۔ بلکہ یہ اپنے قیامِ انگلستان کے دوران نماز بھی پابندی سے پڑھتا تھا سرکار نے فرمایا "فخر یار جنگ۔ تم خوش قسمت ہو کہ تمہارا لڑکا یہ عِلّت اپنے ساتھ نہیں لگا لایا۔ ورنہ جس کو دیکھو اس جنس کو اپنے پیچھے لگا لاتا ہے۔"

ان واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ خسروِ دکن کس قدر فرسِ اور مردم شناس تھے وطن کے رسم و رواج، اسلامی روایات اور مذہب سے حد درجہ عشق رکھتے تھے۔ صائب الرائے کے مشوروں کو پسند کرتے اور ان پر عمل کرتے تھے۔ باوجود بادشاہ ہونے کے آمریت کا شائبہ تک موجود نہیں تھا۔

اگر دربار میں نواب فخر یار جنگ جیسی دو چار ہستیاں اور ہوتیں تو ریاستِ حیدرآباد ہمیشہ قائم و دائم رہتی۔

---

لے چٹے کارنی۔ اینگلو انڈین اور یورپین عورت کو حقارت کے طور پر کہا جاتا تھا۔

# شہریارِ دکن اور علیگڈھ

حضور نظام کے جہاں اور بہت سے خطابات تھے ان میں سلطان العلوم کا بھی خطاب تھا جو عوام نے انہیں دیا تھا۔ یہ خطاب محض اس لئے نہیں دیا گیا تھا کہ وہ بادشاہ تھے یا اردو، فارسی، عربی، انگریزی اور ترکی زبانوں پر اہلِ زبان کی طرح عبور رکھتے تھے یا اس لئے کہ وہ شاعر تھے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ علوم و فنون کے عاشق تھے، سرپرست تھے اور مسیحا بھی تھے۔ انھوں نے اپنے لئے کچھ نہیں کیا لیکن جہاں علم کا سوال اٹھا وہاں انھوں نے لاکھوں اور کروڑوں اپنی جیبِ خاص سے عنایت کئے۔ ہندوستان اور بیرونِ ہندوستان کے بیشتر ادارے محض حضور نظام کی بیش بہا امداد کے باعث چلا کرتے تھے۔ بیشتر ادارے ایسے بھی تھے جو مالی کمزوریوں کے باعث دم توڑ رہے تھے حضور نظام کی امداد نے ان کے تنِ ناتواں میں روح پھونک دی۔ علم کے اس رسیا اور مسیحا کا احسان کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

۱۸۵۷ء کے بعد مسلمان ذہنی، علمی، تہذیبی، معاشی اور سیاسی افلاس کا شکار ہو چکے تھے ان میں قوت و ہمت باقی نہیں رہی تھی کہ وہ ہندو

اور انگریزوں کی سرکش طاقتوں کے خلاف لڑ سکیں. سر سید احمد خاں سرکاری ملازم ہونے کے باوجود مسلمانوں کی حمایت کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے اور انھوں نے اسی میں مصلحت سمجھی کہ انگریزوں کے ساتھ صلح کی جائے اور پھر ان ہی کے ہتھیاروں سے اپنے وجود، اپنی بقا، اور اپنے تحفظ کے لئے جنگ کی جائے۔

سر سید احمد خاں سے پہلے بھی ایسے نازک مواقع آئے جہاں مسلمانوں کی زندگی دوراہے پر آکر رُک گئی تھی اور مسلمان تدبّر اور مصلحت بینی کے فقدان کے باعث جذباتی سیاست کا شکار ہو گئے تھے. اور جہاں جذباتیت نہیں تھی مصلحت، تدبّر اور فہم و فراست تھی وہاں مسلمان نہ صرف محفوظ رہے بلکہ انھوں نے اپنی سلطنت، اپنا مذہب، اپنی تہذیب و تمدن، اپنی ثقافت اور اپنی روایات کی حفاظت کی ان کے ہاں علم و فن اور تہذیب ترقی کرتے رہے اور اس قدر مضبوط ہو گئے تھے کہ نازک لمحات میں وہ ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے سینہ سپر ہو گئے اور ان کی حمایت اور مالی امداد نے مسلمانوں کے اکھڑتے ہوئے قدموں کو مضبوط کیا۔

۱۸۷۳ء میں دکن میں ایک مضبوط اور مستحکم اسلامی حکومت قائم تھی۔ وہاں کے مسلمانوں کا دین، تہذیب اور ثقافت ترقی کی بلندیوں کی طرف مائل بہ پرواز تھی۔ برخلاف اس کے ہندوستان کے دیگر

حصوں میں مسلمان نکبت و افلاس کا شکار تھے اور من حیث القوم روبہ انحطاط تھے۔ دکن میں اس استحکام کی وجہ سلاطین کا تدبر، عدل، سیاست، فراست اور دور اندیشی تھی۔ اگر دکن اتنا مضبوط اور مستحکم نہ ہوتا تو مسلمانوں کی فلاح و بہبود کی تحریکوں کو وہ تقویت اور وہ سہارا نہ ملتا جو دکن نے دیا تھا۔ اصلاح و احیاء کے سارے شیش محل چکنا چور ہو جاتے۔

۱۸۷۳ء میں سر سید ایک عزم، ایک ارادہ اور ایک لائحہ عمل لیکر اٹھے جس کو علی گڑھ تحریک کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ سر سید کو بڑے سنگین مسائل کا سامنا تھا۔ انھیں مختلف محاذوں پر جنگ لڑنی پڑ رہی تھی۔ اپنوں کی منافقت عفریت کی طرح منہ کھولے ہوئے تھی، مذہب کے میدان میں دیو پیکر چٹانیں حائل تھیں۔ سیاست کے میدان میں ایسے فرعونوں سے مقابلہ تھا جن کے پاس لاؤ لشکر بھی تھا، حکمرانی کے داؤ پیچ بھی تھے اور سازش و مکاری بھی تھی۔ سر سید کو پیروں تلے سے زمین کھسکتی نظر آئی۔ تابناک مستقبل کے خواب شرمندۂ تعبیر ہوتے نظر نہ آئے۔ انہوں نے اللہ کا نام لے کر لنگر اٹھایا۔ ۱۸۷۵ء میں مدرسۃ العلوم کا سنگِ بنیاد رکھا جو آگے چل کر مسلمانوں کی احیاء قومی کا سنگِ میل بنا۔ باعزت زندگی کے لئے ضروری تھا کہ مسلمان علم حاصل کریں اور علم ہی کے ہتھیاروں سے لیس ہو کر دشمنوں کا مقابلہ کریں کہ ان کی بقاء اور وجود کا راز اسی میں

مضر تھا۔

لیکن سرسید کا یہ خواب کیسے شرمندۂ تعبیر ہو سکتا تھا جبکہ ان کے پاس مالی وسائل نہ ہونے کے برابر تھے۔ وہ جس کومل اور نازک پودے کو نخلِ تناور بنانا چاہتے تھے اس کی آبیاری کے لیے ان کے پاس کچھ نہ تھا۔ ان کی نظریں ریاست حیدر آباد کی جانب اٹھیں۔ اس ریاست کی جانب جہاں سرسید کے خوابوں کی تعبیر تھی۔

اس وقت سر سالار جنگ اول دکن کے وزیر اعظم تھے جن کے تدبر اور اصلاحات نے ہندوستان گیر شہرت حاصل کر لی تھی۔ سر سالارِ جنگ اوّل نے سرسید کی آواز پہ لبیک کہا اور انگریزوں کے دباؤ کے باوجود ۱۸۷۵ء میں خزانہ سے دس ہزار روپیہ نقد، تین ہزار چھ سو روپیہ سال کا یومیہ اور جیبِ خاص سے تیرہ ہزار نقد اور موروثی جاگیر سے بارہ سو روپیہ سالانہ مقرر کیا۔ بقول مولوی عظمت الٰہی صاحب زبیری رجسٹرار مسلم یونیورسٹی علیگڈھ۔

"۱۸۷۵ء میں جبکہ حقیقتاً آنے اور پائی بھی اشرفی اور روپیہ کے برابر تھے اس امداد نے جو اس وقت کے عطیات میں سب سے گرانقدر تھی کالج فنڈ کمیٹی کی ہمتیں بڑھا دیں اور مدرسۃ العلوم کی ابتدائی تجاویز کی کامیابی کے حق میں ابرِ رحمت بن گئی۔

ے اجرش دہد خدائے کہ کرد است یاوری

باآں کساں کہ ناصر و یاور نداشتند

کمیٹی کے ممبروں نے اظہارِ شکر گزاری اور اس احسان کی یاد تازہ و قائم رکھنے کے لئے دارالنوادر نظامیہ (نظام میوزیم) تعمیر کئے جانے کی تجویز کرکے اس مبارک تسمیہ کی باقائدہ اجازت حاصل کرلی۔

۱۸۸۲ء میں سر سالار جنگ اول نے چند گھنٹہ علی گڈھ میں قیام کرکے سرسید کی ہشت سالہ مساعی یعنی مدرستہ العلوم کو جب عملی شکل میں ملاحظہ کیا اور اس کی ضرورتیں معلوم کیں تو دو ہزار چار سو روپیہ سال کا اضافہ فرمایا۔

آصف جاہ سادس نے ۱۸۸۴ء میں تین ہزار سالانہ منظور کئے اور ۱۸۵۷ء میں بمنظوری خسروانہ یہ امداد بارہ ہزار روپیہ سالانہ تک پہنچادی۔ ابھی تک یہ امدادیں دولت آصفیہ کے وزرائے عظام کی وساطت سے منظور و مقرر ہوئی تھیں لیکن ۱۸۹۱ء میں خود سرسید نے ایک وفد کے ساتھ اعلیٰحضرت کی بارگاہِ اقدس میں شرف یاب ہو کر ایڈریس میں کالج کی ضرورتیں گذارش کیں۔ ہز ہائی نس نے ماہانہ عطیہ میں دو ہزار کا اضافہ فرمایا۔

۱۹۱۱ء میں اعلیٰحضرت میر عثمان علی خاں تختِ دکن پر جلوہ افروز ہوئے اور ایم۔اے۔او کالج۔ اور اپنی غریب قوم پر اپنے الطاف و اکرام میں

اتنا اضافہ فرمایا کہ وہ اس ادارے کی تاریخ کا سب سے درخشاں باب بن گیا۔

حضور نظام نے سب سے پہلی فیاضانہ عنایت اس طرح ظاہر فرمائی کہ یونیورسٹی کو پانچ لاکھ روپیہ نقد عطا فرمایا اور سالانہ امداد میں بارہ ہزار کا اضافہ فرمایا۔

۱۹۱۵ء میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کو ایک لاکھ اسی ہزار روپیہ کا سرمایہ عطا فرما کر چھ ہزار روپے سالانہ کی مستقل آمدنی کا ذریعہ مقرر کر دیا۔

۱۹۱۸ء میں حضور نظام نے علی گڑھ کا دورہ کیا جہاں ان کا شاہانہ استقبال ہوا اور اعلیٰحضرت نے ایک ہزار روپیہ سالانہ تعلیم عربی کے لئے اور پچاس ہزار روپے کچی بارک کے پختہ کئے جانے کے لئے منظور ہوا۔

یونیورسٹی کی تاسیس کے بعد سالانہ امداد میں بارہ ہزار کا اضافہ کر کے ۲۷ ہزار تک مقدار پہنچادی۔ عرصہ سے یونیورسٹی بجٹ میں خسارہ رہتا تھا۔ اور ترقی تو کجا یونیورسٹی کا معمولی حالت پر قائم رہنا بھی مشکل تھا۔ اراکین یونیورسٹی پر مایوسی چھائی ہوئی تھی۔ نواب سر مسعود جنگ۔ (سر راس مسعود) نے بندگان عالی میں حاضر ہو کر تمام مشکلات عرض کیں۔ نتیجہ میں دس لاکھ نقد مرحمت ہوا اور چوبیس ہزار روپے سال کی مزید امداد عطا ہوئی۔ ان عطایا نے تمام مشکلیں حل کر دیں اور پریشانی اور مایوسی

مسرت اور امیدوں سے مبدل ہو گئی۔

سر سید کے بعد جبکہ کالج ایک نہایت مشکل دور سے گزر رہا تھا اس وقت دولتِ آصفیہ کے مشہور وظیفہ یاب معتمد نواب محسن الملک مولوی سید مہدی علی نے کالج کو قابل رشک بنایا۔ ان کے بعد دوسرے وظیفہ یاب نواب وقار الملک مشتاق حسین نے اس کو سنبھالا۔

۱۹۲۹ء میں بھی نازک حالات میں دولت آصفیہ کے ہی وظیفہ یاب عہدہ دار سر مسعود سر جنگ (سر راس مسعود) نے مسائل کو حل کیا۔ اور امرائے سلطنت مہاراجہ سرکشن پرشاد نواب لطف الدولہ اور نواب معین الدولہ نے دس دس ہزار کی گراں قدر امدادیں عطا فرمائیں۔

علیگڈھ یونیورسٹی کی زمین کے چپّہ چپّہ پر یادگاریں قائم ہیں۔ لیکن بحیثیت مجموعی سب سے زیادہ یادگاریں دولتِ آصفیہ ہی سے نسبت رکھتی ہیں جن میں سے اکثر اہلِ دکن کے روپے سے تعمیر ہوئیں۔

۱۔ نظام میوزیم ۲۔ لیکچر ہال ۳۔ سالار منزل ۴۔ آسمان منزل ۵۔ مہدی منزل ۶۔ مشتاق منزل ۷۔ عثمانیہ ہاسٹل ۸۔ کرکٹ لان پر پویلین۔

حضور نظام کی یہ نوازش ہائے خسروانہ صرف ایم۔ اے۔ او کالج یا یونیورسٹی تک محدود نہیں رہیں بلکہ علیگڈھ تحریک کے دوسرے

ادارے بھی ابرِ کرم سے سیراب ہوتے ہیں. زمانہ کالج، آل انڈیا مسلم لیڈیز کانفرنس وغیرہ کو سالانہ امداد مقرر تھی. ۱۹۱۴ء میں امیر خسرو کے کلام کی شاعت کے لئے خسرو فنڈ" قائم کیا گیا تو حضور نظام نے اس کی سرپرستی فرمائی اور پندرہ ہزار روپیہ عطا کیا.

غرض علیگڈھ تحریک کی تمام تر آبیاری، نشو و نما اور بہار دولتِ آصفیہ اعلحضرت بندگان عالی سلطان العلوم کے سحاب سخا اور بحر کرم سے ہے"

العرض جملہ سرو سامانِ ما

پرتوِ انوار آصف جاہی است.

علوم کہنہ را نو ساختہ اند ٭ بجسنِ ترجمہ پرداختہ اند

# دارالترجمہ

مسلمان صرف تلوار کے دھنی ہی نہ تھے بلکہ علوم و فنون کے میدان میں بھی ان کا کوئی ہمسر نہیں تھا. کبھی قرطبہ، مصر، بغداد و دمشق علوم و فنون کا گہوارہ تھے. یہیں سے علم کی کرن پھوٹی جس سے ایک عالم روشن ہوگیا. یورپ اور امریکہ آج علم و فن کی علمبرداری کر رہے ہیں یہی علم سب سے پہلے عربوں ہی نے بلند کیا تھا. مسلمان درونِ خانہ ہنگاموں کے باعث اس سرمائے سے غافل ہوگئے لیکن مغربی اقوام نے وہ دولت لوٹ لی.

ترجمہ کا فن دیگر فنون کی طرح بہت پرانا ہے اس کی اولیت کا سہرا خلیفہ منصور کے سر ہے. بنو امیہ اور بنو عباس کے علم پرور بادشاہوں نے طب، تاریخ اور فلسفہ کی کتابوں کے لئے دارالترجمے قائم کئے. اس فن کو ترقی ہوتی گئی، مامون رشید کے زمانے میں، یونانی، عبرانی، لاطینی، فارسی اور سنسکرت کی کتابوں کا ترجمہ کیا گیا. فن سے اس ذوق و شوق کے باوجود ان جہانداروں نے اس فن کو ثانوی حیثیت دی. ہندوستان میں سلطان فیروز شاہ نے ترجمہ کی داغ بیل ڈالی. پھر کشمیر کی اسلامی سلطنت

لے بھی دارالترجمہ قائم کیا۔ دہلی کالج اور سرسید احمد خاں کی سائنٹیفک سوسائٹی کے بھی ترجمے بھولنے کے قابل نہیں۔

دکن میں حضور نظام میر عثمان علی خاں کے والد کے زمانے میں دارالترجمہ قائم کیا گیا۔ جس کا نام محکمہ علوم و فنون تھا اور شمس العلماء شبلی نعمانی اس کے ناظم تھے لیکن کچھ عرصے کے بعد یہ محکمہ ٹوٹ گیا۔

اگر دارالترجموں کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ صدیوں سے جو دارالترجمے قائم تھے۔ ان کی مجموعی کارگزاری چار سو کتابوں سے زائد نہ تھی۔

اعلحضرت میر عثمان علی خاں نے ۱۳۳۵ھ میں دارالترجمہ عثمانیہ قائم کیا۔ دارالترجمہ کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ جملہ علوم و فنون کی نادر کتابوں کا اردو زبان میں ترجمہ کیا جائے۔ اور امتدادِ زمانہ کے ہاتھوں اپنے اسلاف کے علمی کارناموں کو نہ صرف محفوظ رکھا جائے بلکہ ان کے افکار سے فیض حاصل کیا جائے۔ چنانچہ جامعہ عثمانیہ میں ان ہی کتابوں پر مشتمل نصاب تیار کیا گیا۔

دکن کا یہ دارالترجمہ علم و فن کی تاریخ میں اپنی مثال آپ تھا۔ لاکھوں روپے کی رقم محض ترجمہ کے لئے مخصوص کی گئی اور اہتمام کے ساتھ اس کام کا آغاز کیا گیا۔ ایک علم پرور بادشاہ کی علم دوستی کے باعث ایسا عظیم الشان کام کیا گیا جس کو علم و فن کی تاریخ میں دوام حاصل ہو گیا۔

دارالترجمہ عثمانیہ میں تاریخ روم، انگلستان، یونان، ہند اور اسلامی

تواریخ، معاشیات، عمرانیات، سیاسیات، فلسفہ ومنطق، طبعی وما بعد الطبیعیات نفسیات، اخلاقیات، قانون، ریاضیات، طبیعات۔ کیمیا، نباتیات حیوانیات طب، علم ہندسہ (انجینیرنگ) اور تدریسیات کے مضامین کی بلند پایہ کتابوں کا ترجمہ کیا گیا۔ اس کام کے لئے دکن اور بیرونِ دکن سے نامور مورخ، اُردو اور انگریزی کے ادیب، عربی و فارسی کے زبان داں، طب کے نامور عالم، ریاضیات کے ماہرین کی اعلیٰ مشاہرہ پہ خدمات حاصل کی گئیں۔

اراکین دارالترجمہ میں قاضی تلمذ حسین جیسے انشاپرواز، مولوی مسعود علی محوی جیسے قانون داں مولوی سید محمد ابراہیم (ندوۃ العلماء کے تعلیم یافتہ خاندان حضرت خواجہ سید احمد بریلوی کے چشم وچراغ) سردار بلدیو سنگھ پنجاب یونیورسٹی کے شعبۂ سائنس کے نگران، مولوی فدا علی طالب مدرسہ تعلق داران لکھنؤ کے استاد، مولوی احسان احمد انصاری علی گڈھ کے گریجویٹ، مولوی عبدالستار جامعہ کے اسٹیٹ اسکالر مولوی سیّد ابوالخیر مودودی عربی کے فاضل، مولوی رشید احمد مسلم یونیورسٹی کے گریجویٹ سول سروس کے لکچرار، مولوی نذیر الدین، خواجہ عبد القدوس، ڈاکٹر محمد عثمان خاں، ڈاکٹر غلام رشید، ڈاکٹر محمد حسین اور علامہ عبداللہ العمادی چودھری برکت علی۔ عبدالماجد دریا بادی، ہاشمی فرید آبادی، اور جوش ملیح آبادی، ظفر علی خاں جیسے نامور اہل علم وفن شامل تھے۔

ناظمانِ دارالترجمہ میں مولوی عبدالحق، مولوی سید محی الدین بار ایٹ لا، مولوی حمید احمد انصاری، مولوی عنایت اللہ (شمس العلماء منشی ذکا اللہ کے فرزند) اور مولوی محمدؐ الیاس برنی جیسی مایۂ ناز ہستیاں شامل تھیں. دارالترجمہ سے صرف یہی ہستیاں وابستہ نہیں رہیں بلکہ کام کی رفتار کے ساتھ ساتھ اور نامور ہستیاں شامل ہوتی گئیں۔ دارالترجمہ میں ایک مجلس مصطلحات بھی قائم کی گئی تھیں جس کا کام مختلف فنون کی اصطلاحیں وضع کرنا تھا۔اس مجلس نے جو کام کیا اس سے آج بھی مختلف یونیورسٹیوں میں فائدہ حاصل کیا جارہا ہے۔

حضور نظام کا یہ عظیم الشان کارنامہ ان کی علم پروری اور علم پروری اور علم دوستی کا بین ثبوت ہے۔ دارالترجمہ کے لئے حضور نظام نے لاکھوں روپے صرف کئے۔

بقول علامہ عبداللہ العمادی رکن و ناظر دارالترجمہ کے

" مامون نے کوئی یونیورسٹی قائم نہیں کی تھی، محض دارالترجمہ کے باعث علم وفنون میں اس کا نام روشن ہے۔ مشرق ومغرب کی تاریخیں ہزار سال سے اس کی تعریف کرتی چلی آئی ہیں۔ اس کے تراجم دوسو کے اندر تھے۔ اعلحضرت کے دارالترجمے کو اس کو کیا نسبت؟ جتنے دارالترجمہ اس سے پہلے تھے سب کی مجموعی کارگزاری چارسو کتابوں سے زائد نہ تھی لیکن اعلحضرت سلطان العلوم کے دور میں دارالترجمہ عثمانیہ پانچسو سے زیادہ کتابوں کے تراجم کا انتظام کرچکا ہے۔"

# دائرۃ المعارِف

مسلمانوں کا علمی سرمایہ عربی زبان میں ہے۔ اہل یورپ نے ان علوم کو نہ صرف اپنی زبانوں میں منتقل کر لیا بلکہ علمی انجمنیں قائم کر کے طباعت و اشاعت کے ذریعہ عربی زبان میں محفوظ کر دیا۔

ہندوستان میں ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ نے عربی و فارسی مخطوطات کی تحقیق و تلاش اور ان کی طباعت و اشاعت کا انتظام کیا۔

یورپ کی اسی تحقیقاتِ علمیہ کا اثر ریاست حیدر آباد دکن پر بھی پڑا۔ حضور نظام کے کارناموں میں ایک درخشاں کارنامہ اسلامیہ پردہ احسان ہے جسکی دنیائے اسلام ہمیشہ مرہونِ منت رہے گی۔ اعلیٰحضرت نے دائرۃ المعارف نے براہ معارف نوازی پانچ لاکھ روپے کے بیش بہا عطیہ سے اس کی تنظیم توسیع کے اس ادارہ کو صحیح خطوط پر چلانے کے لئے علماء و فضلاء کا انتخاب عمل میں آیا۔ قابلِ اشاعت قدیم کتب کی تحقیق و تلاش ہوئی۔ اس کے لئے ایک قابل شخص کو بیرونِ ملک بھیج کر وہاں کے مختلف اداروں خانگی اور سرکاری کتب خانوں کے نایاب اور کمیاب قابلِ اشاعت مخطوطات کا پتہ چلایا گیا۔ متعدد قلمی نسخے فراہم کئے گئے۔

ان کی طباعت کے لئے عملہ اور پریس کا انتظام کیا گیا۔ اس ادارے سے مختلف علوم فنون کی جو کتابیں شائع ہوئیں ان کی تعداد کل مجلدات دوسو سے زائد ہیں۔ اس طرح دائرۃ المعارف کی برکت سے علمائے اسلام کے نوادرات د جواہر زبرے جو دست بردِ زمانہ سے تلف ہو رہے تھے وہ محفوظ ہو گئے اس ادارے نے دنیائے اسلام میں دھوم مچادی اس لئے کہ اسی ادارے کی وجہہ سے اسلامی علوم اور فنون کا احیاء ہوا اور جس کی جود وسخا کے باعث ایسا ہوا وہ صحیح معنوں میں سلطان العلوم کے خطاب سے یاد کیا جانے لگا۔

---

زندہ کردی چوں مسیحا علم وفن را در دکن

# جامعہ عثمانیہ

ہندوستان کی تاریخ میں خواہ وہ سیاست کی تاریخ ہو یا تہذیب و تمدن کی، ثقافت کی ہو یا زبان وعلم کی، جنوبی ہند نے ہمیشہ بہت اہم کردار ادا کیا ہے اور ادا کر رہا ہے۔ جنوبی ہند میں خصوصیت کے ساتھ دکن کا تاریخ کے ہر دور میں نمایاں کردار رہا ہے۔ اس سرزمین کو اردو کا مرکز بننے کا شرف حاصل ہو چکا ہے۔ اردو نثر و نظم کا آغاز یہیں سے ہوا اردو زبان کی نشوونما یہیں ہوئی۔ عروسِ اردو کی زلفیں یہیں بنائی اور سنواری گئیں اور ایک وقت دکن میں ایسا بھی آیا کہ گیسوئے اردو منت پذیرِ شانہ نہیں رہے۔ دکن نے عروسِ اردو کو وہ حسن اور تابنا کی بخشی کہ اسکے عاشق کھنچے کھنچے دکن چلے آئے اور وہ سارے ہندوستان کی نگاہوں کا مرکز بن گیا۔

بہمنی سلاطین کے دور میں دکنی زبان (قدیم اردو) خاص وعام کی زبان تھی۔ سلاطین کے درباریوں یا صوفیوں کی خانقاہیں، امراء کے محل ہوں یا غریب کی جھونپڑی ہر جگہ اردو ہی کی حکمرانی نظر آتی تھی۔ اولیاء و صوفیائے کرام نے اسی زبان کو رُشد و ہدایت کا ذریعہ بنایا۔

قطب شاہی سلاطین کے دور میں اردو نظم ونثر کو کمال حاصل ہوا چنانچہ محمد قلی قطب شاہ قطب شاہی خاندان کا نہ صرف پہلا تاجدار ہے بلکہ اردو کے پہلے صاحبِ دیوان شاعر ہونے کا تاج بھی اس کے سر پر رکھا گیا۔ قلی قطب شاہ کے بعد اس کے جانشینوں نے نہ صرف دونوں تاجوں کی حفاظت کی بلکہ خاص طور پر اردو کے تاج کو لعل وگہر سے مزین کیا۔ چنانچہ سلطان محمدؐ قلی، محمدؐ عبداللہ اور تانا شاہ باکمال شعراء تھے۔ ان کے دور میں اردو شاعری کی مختلف اصناف وجود میں آئیں جن میں مثنوی، قصیدہ، مرثیہ، غزل، ترجیح بند اور رباعیات شامل ہیں۔

دکن کو اس پر بھی ناز ہے کہ اردو نثر کا آغاز بھی یہیں سے ہوا۔ حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز نے اپنی تعلیمات کے لئے اردو زبان کو اپنا ذریعہ بنایا۔ ان کا رسالہ "معراج العاشقین" مذہبی رسائل اور اردو نثر کا پہلا رسالہ سمجھا جاتا ہے۔

اردو نثر کا پہلا تاجدار ملا وجہی ہے جو قطب شاہی دربار سے منسلک تھا جس کی "سب رس"، اردو نثر کا اولین نمونہ ہے۔ "سب رس" ادبی اور لسانی خصوصیات کے اعتبار سے اہمیت کی حامل ہے۔

آصفجاہی سلاطین کا دور اردو کے لئے بہت مبارک ومسعود ثابت ہوا۔ اس خاندان کے پہلے بادشاہ آصف جاہ اوّل آصفؔ علم دوست تھے۔ آپکو

شاعری سے خاص مناسبت تھی۔ ان ہی کے دور میں وہ شاعر پیدا ہوا جس کا اردو شاعری پر بڑا احسان ہے۔ ولی رکھنی اپنی فنی خصوصیات کے باعث اردو شاعری کا پہلا تاجدار نہ ہوتے ہوئے بھی تاجدار کہلائے گا کہ خدائے سخن میر تقی میر نے اس کی شاعری کا لوہا مان لیا ہے۔

وقت تیزی سے گذرتا گیا۔ مہینے سال سے بدلتے گئے اور اس کے ساتھ ساتھ اردو جس کو سلاطین نے سینے سے لگایا اور صوفیوں نے اپنے زیر سایہ پروان چڑھایا آصفی خاندان کے دور میں ایسا گھنا اور تناور درخت بن گیا جس کی ٹھنڈی چھاؤں میں قافلوں نے پناہ لی۔

دہلی کا دبستان اجڑ گیا تو اہلِ کمال اور اہلِ فن نے لکھنؤ کو آباد کر دیا لیکن امتداد زمانہ نے لکھنؤ کو بھی اجاڑ دیا۔ لکھنؤ کیا اجڑا ایک انجمن اجڑ گئی۔ اہلِ کمال اور اہلِ فن بے یار و مددگار ہو گئے۔ ان کی نگاہیں دوسری ریاستوں کیجانب اٹھیں لیکن انھیں کہیں ایسا ماحول نظر نہیں آیا جہاں وہ ایسی انجمن قائم کرتے اور اپنے جوہر دکھا سکتے۔ جنوبی ہند میں حیدرآباد ہی وہ ریاست تھی جو سارے ہندوستان میں نہ صرف خوشحالی اور فلاحی ریاست تھی بلکہ وہاں کا شہریار مسلم اقتدار کا مظہر تھا، علم دوست اور علم پرور تھا، جو خود مختلف زبانوں کا ماہر تھا، شاعر تھا اور اہلِ فن کا قدردان بھی تھا۔ چنانچہ خسروِ دکن نے ان اہلِ کمال کو حیدرآباد دکن آنے کی دعوت دی۔ سارے ہندوستان سے ایسے

ایسے جوہر تلاش کیے جو پردہ گمنامی میں اپنی آب و تاب کھو رہے تھے۔ جب وہ دکن آئے تو ان کی صلاحیتوں کی قدردانی بھی کی اور ایسی قدردانی کہ جو علم و فن کی تاریخ کا ایک بے مثال باب بن گئی۔

دلی اور لکھنؤ کے اجڑنے کے بعد دکن کا دبستان آباد ہو گیا اور دکن علم وفن کا گہوارہ بن گیا۔ ان آنے والوں کو علم وادب اور اسلامی ثقافت سے پیار تھا اسی محبت کے باعث وہ جوق در جوق حیدرآباد کی جانب چل کھڑے ہوئے ان میں سپاہی بھی تھے، مورخ بھی تھے، ادیب بھی تھے۔ شاعر بھی تھے، نثار بھی تھے، مصور بھی تھے اور علماء وفقہا بھی تھے۔

مرزا عبداللہ خاں (مرزا غالب کے والد) سر سید احمد خاں، علامہ شبلی نعمانی، علامہ اقبالؒ، الطاف حسین حالیؔ، ڈپٹی نذیر احمد، وقار الملک مولوی مشتاق علی، محسن الملک مولوی سید محمدؐ علی، مولوی چراغ علی، منشی ذکاءاللہ، رتن ناتھ سرشارؔ، عبدالحلیم شررؔ، مولانا ظفر علی خاں، امیر مینائیؔ، داغؔ، فصاحت جنگ جلیلؔ مانک پوری، نظم طباطبائیؔ، جگر مرادآبادی، جوشؔ ملیح آبادی، عظمت اللہ خاں، مولوی عزیز مرزا، مرزا محمدؐ ہادی رسواؔ، خواجہ حسن نظامی، علامہ سلیمان ندوی، ڈاکٹر عبدالحق، مولانا وحیدالدین سلیم، مولوی فرحت اللہ بیگ، عظمت اللہ بیگ، مولانا عبدالقدیر بدایونی، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا ابوالخیر مودودی، سر راس مسعود، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی (ماہر لسانیات) سر علی امام،

علامہ عبداللہ العمادی ، عبدالماجد دریابادی ، ہاشمی فرید آبادی ، مولوی الیاس برنی ، مولوی عنایت اللہ (منشی ذکااللہ کے فرزند) قاضی عبدالغفار، سبطِ حسن ، غلام محمدؒ مرحوم (گورنر جنرل پاکستان) زاہد حسین مرحوم (گورنر اسٹیٹ بنک پاکستان) ، ہوش بلگرامی ، نواب مخر یار جنگ مرحوم ۔ بقول چودھری خلیق الزماں صاحب" یہ لوگ کیا تھے اور حیدرآباد نے انھیں کیا بنا دیا ۔ ان کی تربیت حیدرآباد نے کی "

نہ جانے کتنے ہی ایسے اہل کمال تھے جو دکن آئے ، اپنے جوہر دکھائے اور وہیں پیوندِ خاک ہو گئے ۔ حضور نظام کی مردم شناس نگاہوں نے ہر اہلِ کمال سے اس کی صلاحیت کے مطابق کام لیا ۔ ہر شعبۂ زندگی میں خواہ وہ عدلیہ ہو یا انتظامیہ ، مالیات ہو یا سیاسیات تعلیم ہو یا صنعت وحرفت ان جواہر پاروں نے اپنی پوری صلاحیتوں سے کام لیا اور حق تو یہ ہے کہ حق ادا کر دیا ۔ حضور نظام نے ان میں سے اکثر کو اپنے دربار سے منسلک کر لیا اور وہ آخر وقت تک ان کے مشیر بھی رہے ، بہی خواہ بھی رہے اور ہر حال میں شریکِ کار رہے ۔

حضور نظام نے ان دانشوروں کو بیش قرار تنخواہیں دیں ۔ جو اہلِ کمال دکن نہ آسکے انھیں بھی وظائف مقرر کئے جو ان کے بعد ان کے ورثا کو ملتے رہے ۔ اہلِ ظرف اس قدر دانی پہ ہمیشہ شکر گزار رہے ۔

حضور نظام نے اردو زبان کی جو خدمت کی اردو ان کے بار احسان سے کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتی۔ خسروِ دکن کا زندۂ جاوید کارنامہ جامعہ عثمانیہ کا قیام ہے۔ جامعہ عثمانیہ صرف ایک جامعہ ہی نہیں تھی بلکہ اردو تحریک کا ایک سنگ میل تھی۔ اس کے قیام کے باعث اردو جو صرف خانقاہوں، درباروں اور بازاروں میں بولی جاتی تھی علمی، ادبی اور تعلیمی زبان بن گئی۔ خسروِ دکن کا یہ انتہائی جرارت مندانہ اقدام تھا حالانکہ وہ انگریزوں کے زیرِ اثر تھے لیکن ان کی مرضی کے خلاف ان کی ناراضگی کی پرواہ کئے بغیر ایک تحریک چلائی اور اس کو کامیابی کی انتہائی منزل پر پہنچا دیا۔

جامعہ عثمانیہ کے قیام نے یہ ثابت کر دیا کہ اردو میں اتنی وسعت اور ہمہ گیری ہے کہ وہ ہر شعبۂ زندگی میں اظہارِ خیال کی زبان بن سکتی ہے۔ حیدرآباد دکن میں عدالتی زبان اردو تھی، تجارتی مراسلت اور حسابات کے لئے اردو استعمال کی جاتی تھی، شاہی فرامین اردو میں لکھے جاتے تھے؛ امورِ سیاست کی گتھیاں سلجھانے کے لئے یہی زبان استعمال ہوتی تھی۔

جامعہ عثمانیہ میں سارے علوم طبعی وغیر طبعی، فلسفہ، مذہبی، اخلاقی، ادبی، تاریخی، طبی (مشرقی و مغربی)، قانونی، زراعتی، تجارتی اعلیٰ تعلیم، مختلف پیشوں ڈاکٹری، انجینیرنگ کی اعلیٰ تعلیم اردو زبان ہی میں دی جاتی تھی۔ دنیا بھر کی یونیورسٹیوں نے جامعہ عثمانیہ کی اعلیٰ تعلیم اور اعلیٰ معیار کو تسلیم کیا خصوصیت

سے میڈیکل کالج اور انجینیرنگ کالج سے فارغ التحصیل طلباء کو بلاکسی پس وپیش کے اپنی یونیورسٹیوں میں داخلہ دیتے تھے۔ جبکہ ہندوستان کے بہت سے میڈیکل کالجوں کو یورپ کی یونیورسٹیوں نے تسلیم بھی نہیں کیا تھا۔

جامعہ عثمانیہ کا سنگ بنیاد ۱۹۱۹ء میں رکھا گیا۔ مقامی اور بیرونی انجینیروں نے اس کا نقشہ تیار کیا۔ اس کی تعمیر میں ½ ۲ کروڑ روپے خرچ ہوئے۔ یہ عمارت اپنی دلکشی اور خوبصورتی کے باعث ایشیاء اور یورپ بھر میں مشہور ہے۔ اس دانش گاہ کی عمارت مختلف تہذیبوں کا بہترین امتزاج ہے۔ اسکی زیریں منزل ہندو صنعت یعنی ایلورہ کی وضع اور بالائی منزل اسلامی حسن کاری کا عمدہ نمونہ ہے۔ جامعہ اور اس سے متعلقہ عمارات، اقامت خانے، ڈائیننگ روم (ہندو اور مسلمان طلبہ کے لئے علیحدہ علیحدہ طعام خانے تعمیر کروائے گئے تھے) سائنس کالج اور اسٹاف کے مکانات چودہ سو ایکڑ کے رقبہ پر پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ ساری عمارت اپنی وسعت اور خوبصورتی کے اعتبار سے امراء کے محلوں سے کم نہیں ہیں۔ اقامت خانوں میں سینکڑوں طلباء قیام پذیر تھے جہاں انھیں قیام وطعام کے لئے صرف ۱۰ روپے ادا کرنے پڑتے تھے۔

شہر کے ہنگاموں سے دور پر فضا ماحول میں ایسی بستی بسائی گئی تھی جہاں کے ذرہ ذرہ میں دلکشی اور رعنائی تھی۔ فطرت کا حسن، وسیع سبزہ زار، دلکشا اور

پُر شکوہ عمارتیں، علمی ماحول، قہقہے، زندگی، زندہ دلی، غرض کہ جہاں قدم قدم پر مسرت رقصیاں نظر آتی تھی۔ یونیورسٹی کے احاطے میں داخل ہوتے ہی ایک انجانی مسرت اور برتری کا احساس ہوتا ہے۔

تشنگانِ علم کی سیرابی کے لئے نہ صرف ہندوستان بلکہ برطانوی ہند کے قابل اور تجربہ کار دانشوروں کی خدمات حاصل کی گئیں۔ توسیعی تقاریر، علمی کانفرنسیں، ادبی جلسے، مشاعرے غرضکہ سماجی، ذہنی، جسمانی نشو ونما کے لئے ایسا کون سا سامان تھا جو فراہم نہیں کیا گیا تھا۔ ہر سال طالب علموں کی ایک بڑی جماعت ڈاکٹری، انجینیرنگ، زراعت کی اعلیٰ تعلیم کے لئے حکومت کے وظیفہ پر یورپ، برطانیہ اور امریکہ بھجوائی جاتی تھی۔ چنانچہ حیدرآباد وہ واحد ریاست تھی جہاں ہندوستان کی تمام ریاستوں کے مقابلے میں تعلیم یافتہ لوگوں کی اکثریت تھی۔

جامعہ عثمانیہ نے جتنے ڈاکٹر، انجینیر اور مختلف علوم کے ماہر پیدا کئے اس کا شرف کسی اور ریاست کو حاصل نہ ہو سکا۔

جامعہ عثمانیہ اور دیگر کالجوں میں غریب طلباء کی فیسیں معاف تھیں۔ ذہین طلباء کی ہمت افزائی کے لئے وظائف دئے جاتے تھے۔ اضلاع سے جو طلبار جامعہ عثمانیہ میں حصول علم کے لئے آتے تھے ان میں سے کثیر تعداد طلباء کی فیس معاف کر دی جاتی تھی اور انھیں اعلیٰ تعلیم کے لئے وظائف دیئے

جاتے تھے۔

غرضکہ جامعہ عثمانیہ علم کا ایک ایسا دریا تھا جس سے امیر و غریب سب ہی نے اپنی تشنگی بجھائی اور اسی کے طفیل آج باعزت زندگی بسر کر رہے ہیں۔

ایسے ماحول نے ہمہ گیر صلاحیتیں رکھنے والی شخصیتیں پیدا کیں۔ اس دانشکدہ نے ایسے فرزند پیدا کئے جنہوں نے زندگی کے ہر شعبہ میں نہ صرف ایشیاء بلکہ یورپ میں بھی ناموری حاصل کی اور آج بھی سیاست و قیادت، علم و ادب، سائنس اور طب، معاشیات و تجارت ہنکاری، تعمیرات، انجینیرنگ، عدلیہ و انتظامیہ کے میدان میں اپنی مہارت کے باعث خراجِ تحسین حاصل کر رہے ہیں۔

جامعہ عثمانیہ کی کامیابی کسی ایک فرد واحد کی کامیابی نہیں ہے بلکہ اس میں ان دانشوروں کا بھی حصہ ہے جنہوں نے اس کو اوجِ کمال پر پہنچانے کیلئے اپنی زندگی کی آخری سانس تک خدمت انجام دی۔

نواب بہادر یار جنگؒ نے ایک موقع پر ان دانشوروں کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ۔

"..... ہم اس غرض سے بلائے جانے والوں اور ہمارے ملک کے خدمات انجام دینے والوں کی خدمات کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتے جنہوں نے اب حیدرآباد کے فرزندوں کو اس قابل بنا دیا ہے کہ وہ انکے سہارے کے بغیر کھڑے ہی نہیں بلکہ میدان کارزار میں بلا خوف و خطر دوڑ سکتے ہیں۔"

# ترقی پسند تحریک اور حضور نظام

۱۹۳۵ء میں اردو ادب میں ایک نئی تحریک نے سر ابھارا۔ اس تحریک کو "ترقی پسند تحریک" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس تحریک کا ابتدائی دور بہت جذباتی تھا۔ اس تحریک سے وابستہ ادیب اور خاص طور پر نوجوان ادیب مارکسزم سے بہت متاثر تھے چنانچہ سیاسی مقاصد کے حصول کے لئے ادب کو آلۂ کار بنایا۔ اس تحریر کے علمبردار شاہی نظام کے سخت مخالف تھے ان کو ماضی کے ورثہ سے سخت نفرت تھی۔ روحانیت ان کے نزدیک ایک ڈھکوسلہ تھی انھوں نے مادیت کو اوڑھنا بچھونا بنالیا تھا۔ یہ تحریک اپنے اندر خواہ کتنے ہی نیک اور عظیم مقاصد رکھتی ہو لیکن اس کا سب سے عظیم مقصد شہنشاہیت اور جاگیرداری نظام کو بیخ و بُن سے اکھاڑنا تھا۔ چنانچہ دکن کا سیاسی علمی اورادبی ماحول اسکو بہت راس آیا اور اس نے دکن میں اپنی جڑیں دور دور تک پھیلادیں۔ اس نے حیدرآباد کے علمی و ادبی حلقوں میں جگہ پائی اور اپنے بہت سے مداح پیدا کر لئے چنانچہ انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد رکھی گئی۔ اس انجمن کے زیرِ اہتمام عظیم الشان جلسے ہوئے اور ان جلسوں میں ہندوستان کے کونے کونے سے اس تحریک کے پرستاروں نے حصہ لیا۔ دھواں دھار تقریریں کیں، لٹریچر تقسیم کیا، شاندار

مشاعرے منعقد کئے جس میں ترقی پسند شاعروں نے پوری آزادی کیساتھ انقلابی نظمیں پڑھیں۔ ان جلسوں اور مشاعروں میں حصہ لینے والوں میں مقامی فن کاروں کے علاوہ سبطِ حسن، علی سردار جعفری، جوش ملیح آبادی، کیفی اعظمی، ساحر لدھیانوی، مجروح سلطان پوری، ملک راج آنند، کرشن چند اور مہندر ناتھ وغیرہ شامل تھے، دکن میں اس تحریک کے علمبردار مخدوم محی الدین تھے جنہوں نے کمیونسٹ لیڈر کی حیثیت سے بین الاقوامی شہرت حاصل کی یہ تحریک شاہی نظام کے لیے سمِّ قاتل تھی اور اس کی ضرب تاجِ شاہی اور ماضی کی روایات پر پڑتی تھی، لیکن آصفِ سابع خود علم پرور اور ادب نواز تھے۔ اس لئے انہوں نے اپنی وسیع النظری اور کشادہ دلی کا ثبوت اسطرح دیا کہ اس تحریک پر کوئی پابندی عائد نہیں کی، کسی سے باز پرس نہیں کی، باہر سے آنے والوں پر نہ صرف پابندی عائد نہیں کی بلکہ انہیں تقریر و تحریر کی پوری آزادی دیدی تھی۔

"حیدر آباد میں ایک بک ڈپو ایسا بھی تھا کہ جہاں اشتراکی کتابیں جن کا داخلہ ہندوستان میں بند تھا کثیر تعداد میں ملتی تھیں۔" اس تحریک سے خود انگریز بھی نالاں و ترساں تھے لیکن شہریارِ دکن نے اس ادبی تحریک کو پروان چڑھنے کا پورا موقع دیا۔ حالانکہ اس کی راست ضرب تاج شاہی پر پڑتی تھی۔

# حکمرانی کا یہ اندازِ کیسے آتا ہے

سائنس کی ترقی کے اس دور میں مادیت اور روحانیت ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہیں اور ایک دوسرے پر غلبہ پانے کی کوشش میں ہیں نظریات اور اعتقادات بدلتے جا رہے ہیں۔ اشتراکیت، اشتمالیت، نازی ازم، فاشزم اور سوشلزم کے فلسفے بنتے بگڑتے جا رہے ہیں۔ شہنشاہی نظام کی جگہ جمہوری نظام لے رہا ہے اور نت نئے تجربات کئے جا رہے ہیں۔ پرانی تہذیب کی جگہ نئی تہذیب لے رہی ہے۔ مشرقی اقدار مغربی تہذیب کی روشنی میں اپنی قدر و قیمت کھوتی جا رہی ہیں۔ کہیں نئی تہذیب کو مخربِ اخلاق سمجھا جا رہا ہے اور کہیں نئے سماج اور نئے معاشرہ کی تشکیل و تعمیر کے منصوبے بنائے جا رہے ہیں۔

اس جمہوری دور میں بھی کہیں شہنشاہی نظام قائم ہے، کہیں آمریت عذابِ جان بنی ہوئی ہے کہیں جمہوریت کے حدود متعین کئے جا رہے ہیں۔ ابھی بہت سے ممالک ایسے بھی ہیں جہاں جمہور کی حکمرانی کے باوجود تہذیب پر جمود طاری ہے، علم و فن کی ترقی کا آغاز ہو رہا ہے اسلامی روایات اور اسلامی ثقافت کی احیاء کی کوششیں جاری ہیں۔ ان حالات

اور واقعات کی روشنی میں ہم ۱۸ برس پہلے کے دکن پر نظر ڈالیں تو وہاں ڈہائی سو سالہ بادشاہی نظام قائم ہے اس ریاست کی تہذیب، تمدن، علم و فن، صنعت و حرفت اور نظامِ مملکت کا غائر مطالعہ کیا جائے تو ہر شعبۂ زندگی میں ترقی اپنے عروج پر نظر آتی ہے۔ شہنشاہیت کے باوجود حکومت کی بنیاد جمہوریت پر رکھی گئی تھی۔ جہاں اشتراکی نظام نہیں تھا اس کے باوجود ایک مستحکم معاشی نظام قائم تھا، جہاں جدید تہذیب قدیم تہذیب کے ساتھ ہم آہنگ تھی۔ مادی دور میں بھی روحانیت سے عقیدت کا اظہار کیا جاتا تھا، شہنشاہیت کے باوجود عوام کا شعور بیدار تھا، عوام کو جاہل رکھ کر حکومت کرنے کی بجائے انھیں فکر و عمل اور عقل و دانش کے ہتھیاروں سے لیس کیا جاتا تھا۔ اعلیٰحضرت میر عثمان علی خاں باوجود مطلق العنان بادشاہ ہونے کے اپنی ریاست کو جمہوریت کے سانچے میں ڈھالنا چاہتے تھے۔

سنہ ۱۹۱۹ء سے قبل وزارتِ عظمیٰ کے فرائض خود آصف سابع انجام دیتے تھے۔ سنہ ۱۹۱۹ء میں مملکت کے بہتر انتظام کے لئے ایک ایکزیکٹیو کونسل (بابِ حکومت) قائم کی گئی جس کے اراکین تجربہ کار اور اعلیٰ صلاحیتوں کے مالک تھے۔ فرمان شاہی کے الفاظ یہ ہیں۔

"ما بدولت کے قطعی و کامل اقتدار کے تحت حکومت کا کام اور اس

کی ذمہ داریاں ایک مجلس کے سپرد کئے جائیں۔ مملکت کے بہترین نظم کے لئے مابدولت کا ارادہ ہے کہ وسعت کے ساتھ زیادہ اجتماعی نہ کہ شخصی اختیارات کا عمل درآمد ہو۔ حسبۂ مابدولت کا مصمم ارادہ ہے کہ ایک بڑا حصہ ان فرائض کا جسے مدارالمہام نے انجام دیا ہے جلد سے جلد ایگزیکٹیو کونسل یعنی بابِ حکومت کے تفویض کیا جائے۔ اس بابِ حکومت کے اراکین تجربہ کار عہدہ دار ہوں گے۔"

اس فرمان کے تحت" بابِ حکومت" کا قیام عمل میں لایا گیا جو صدر اعظم کے علاوہ آٹھ اراکین پر مشتمل تھا۔ صدارتِ عظمیٰ پر سر علی امام کا تقرر منظور کیا گیا۔ اس مجلسِ وزرا (بابِ حکومت)، کا قیام اس بات کا بین ثبوت ہے کہ حضور نظام نے اجتماعی اختیارات کو شخصی اختیارات پر ترجیح دی۔ وہ ریاست حیدرآباد کو ایک فلاحی ریاست بنانا چاہتے تھے چنانچہ وہ اپنے اس عظیم مقصد میں کامیاب ہوئے۔ بابِ حکومت کے تحت ملک کے ہر شعبۂ زندگی میں بے پناہ ترقی ہوئی اور نظم ونسق میں ایسی اصلاح ہوئی کہ دوسری ریاستوں حتیٰ کہ ملکوں نے حیدرآباد کی اس ترقی کو رشک کی نظروں سے دیکھا۔

## عدلیہ سے عاملہ کی علٰحدگی:۔

ریاستِ دکن وہ واحد ریاست تھی جہاں عدلیہ کو عاملہ سے علٰحدہ

کر کے پورے برِ صغیر میں ایک مثال قائم کی گئی تھی۔ عدلیہ کو عاملہ سے علیحدہ کرنے کے بعد ریاست میں بدعنوانیوں، رشوت ستانیوں اور بددیانت عہدہ داروں کا قلع قمع ہوگیا اور حیدرآباد صحیح معنوں میں ایک فلاحی ریاست بن گیا۔

اپنی ایک تقریر میں نواب بہادر یار جنگ نے ان الفاظ میں آصفِ سابع کو خراجِ تحسین پیش کیا "حیدرآباد کی خوش نصیبی کہ اس کے تخت پر ایک ایسے بیدار مغز بادشاہ کی رونق افروزی کی صورت میں نمایاں ہوگئی جو نہ صرف رعایا کی جسمانی و معاشرتی فلاح و بہبود کی فکر میں لگا رہتا ہے بلکہ اس نے اس کی روحانی اور اجتماعی تربیت کا بھی بیڑا اٹھایا۔"

یہ حقیقت ہے کہ ریاستِ حیدرآباد کو فلاحی ریاست بنانے میں آصفِ سابع کی بیدار مغزی کو بے انتہا دخل حاصل ہے۔ ان کے تدبر اور سیاست نے بہت سی مشکلات پہ قابو پایا۔

ایک طرف آصفِ سابع دکن میں شاہی نظام اور اپنے اقتدار کو ہمیشہ مضبوط رکھنا چاہتے تھے۔ دوسری طرف انگریزوں کا اثر و رسوخ اور تیسری طرف مجلسِ وزراء کا وجود اور پھر درباریوں میں مختلف مزاجوں اور مختلف تصورات کے حامل اشخاص کی جماعت تھی۔ ایسے الجھے ہوئے ماحول کے باوجود دکن نے جو ترقی کی اس کا سہرا

آصفِ سابع کے سر ہے۔

سر علی امام جو وائسرائے کونسل کے ممبر تھے حیدرآباد میں کئی برس تک وزارت عظمیٰ کے فرائض انجام دیتے رہے۔ انہوں نے انتقال آبادی کی ایک اسکیم پیش کی تھی۔ کہ حیدرآباد کے مسلمانوں کو اکثریت میں لانے کے لئے ایک دیگر ریاستوں کے مسلمانوں کو حیدرآباد میں لاکر بسایا جائے۔ اسی قسم کا مشورہ آغا خاں مرحوم نے بھی دیا تھا کہ مہاراجہ کشمیر سے معاہدہ کیا جائے اور اس کے تحت کشمیری مسلمانوں کا حیدرآبادی ہندوؤں سے تبادلہ کیا جائے۔ انتقالِ آبادی کی یہ اسکیم بظاہر بہت موثر اور عمدہ تھی۔ لیکن اتنی سہل اور آسان بھی نہیں تھی جتنی کے سمجھی جاتی تھی۔ آصفِ سابع نے اس اسکیم کو منظور کرلیا لیکن اس کو روبہ عمل نہ لاسکے کیونکہ انگریزوں کی طرف سے ان پر سخت دباؤ ڈالا گیا اور حضور نظام اس اسکیم کو واپس لینے پر مجبور ہوگئے۔ اس کے باوجود حضور نظام نے غیر سرکاری طور پر اس کی اجازت دیدی چنانچہ بہادر یار جنگ اور دیگر عمائدین سلطنت نے درپردہ بیرونی مسلمانوں کو حیدرآباد میں بسانا شروع کردیا۔ حیدرآباد کے ہندوؤں نے احتجاج کیا تو بیرونِ دکن سے آنے والے مسلمانوں پر یہ پابندی عائد کردی کہ وہ ملکی صداقت نامہ حاصل کریں۔ یہ پابندی برائے نام تھی اور بیرونِ دکن کے مسلمان دکنی زبان کے چند الفاظ

مجسٹریٹ کے سامنے دہراتے اور انھیں ملکی صداقت نامہ جاری کر دیا جاتا چنانچہ حیدر آباد میں ایسے افراد کی تعداد لاکھوں تک پہنچ گئی تھی۔

حضور نظام نے پہلی جنگ عظیم کے بعد ہی سے انگریزوں کے اثر و رسوخ سے چھٹکارا پانے کی کوششیں شروع کر دی تھیں چنانچہ اسی مقصد سے انھوں نے جنگ عظیم میں انگریزوں کی مالی امداد بھی کی تھی۔ لیکن مکار انگریزوں نے کسی نہ کسی بہانے اپنے اثر کو قائم رکھا۔

حضور نظام نے بارہا انگریزوں کی عدول حکمی کی اور انگریزوں کی مرضی کے برخلاف ایسے اقدامات کئے جن کے باعث ملک میں تعلیمی اور معاشرتی ترقی ہوئی۔

ان کا ایک بڑا کارنامہ بابِ حکومت کا قیام ہے اس کے قیام سے ان کے اقتدار پر راست ضرب پڑتی تھی لیکن انھیں اجتماعی اقتدار زیادہ عزیز تھا۔

حضور نظامؒ "آئین سلطنت" کا پورا احترام کرتے تھے۔ اگر کوئی تجویز انہیں پسند نہ آتی تو وہ شخصی اختیارات کو کبھی کام میں نہیں لاتے تھے بلکہ اس کی مزید وضاحت چاہتے اور دوبارہ غور کرنے

کی سفارش کرتے ۔ شاذ و نادر ہی ایسا ہوا ہو کہ انھوں نے اپنے اختیارات کو کام میں لاکر کسی تجویز کو نامنظور کیا ہو۔ انہوں نے ہمیشہ آئین کے دفعات کی پوری پابندی کی۔

انھوں نے ہر قسم کی تنقید گوارا کی لیکن شاہی خاندان پر تنقید ان کو گوارا نہیں تھی۔

# عدالت

## عدلیہ اور انتظامیہ

نواب میر عثمان علی خاں کے عہد سے پہلے عدالتی نظم ونسق کی سب سے بڑی خرابی یہ تھی کہ عدالت اور مال کے اختیارات یک جا تھے جس کی وجہ سے عدالتوں پر کام کا بہت بار ہوتا تھا. اور مقدمے عرصے تک چلتے تھے اور اہلِ مقدمہ کو بہت تکلیف اٹھانی پڑتی تھی. اس خرابی کو دور کرکے عدالت کو صرف عدالتی کام کے لئے مختص کر دیا۔

حضور نظام نے ایک خاص فرمان کے ذریعہ عدلیہ کو انتظامیہ سے الگ کر دیا فرمانِ شاہی مورخہ ۲۹ر شعبان ۱۳۲۹ھ "در کچھ عرصے سے میری توجہ اس مسئلے کی طرف مبذول ہوئی ہے کہ نظم ونسقِ ممالکِ محروسہ میں عدالتی اختیارات کو انتظامی عہدوں سے علحٰدہ کر لیا جائے. اس مسئلے پر کامل غور کرنے کے بعد اب میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ موجودہ انتظام میں یہ اصلاح کر دی جائے کیونکہ مجھے یقین ہے کہ اس سے کام بھی عمدگی سے چلے گا اور یہ طریقہ میری عزیز رعایا کے لئے زیادہ تر موجب آسائش واطمینان ہوگا. میں چاہتا ہوں کہ فرائض مذکور الصدر کی علحٰدگی کے لئے جو تجویز عمل میں آئے

اس میں یہ امر ملحوظ رہے کہ عہدہ داران صیغۂ انتظامی ان تمام فرائض سے سبکدوش کئے جائیں جو کلیتہً "عدالتی تصور کیے جاتے ہیں"

عدالت کے عہدہ داروں کے تقررات کا مسئلہ سب سے اہم تھا۔ ہائی کورٹ کے اختیارات بھی اتنی وسعت دی گئی کہ تقررات اور تعینات بڑی حد تک عدالت عالیٰ کے قبضہ میں آگئے۔ اصلاحِ عدالت کے لئے ضرور تھا کہ اعلیٰ خدمات پر ان ہی لوگوں کا تقرر کیا جائے۔ جو نہ صرف اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوں بلکہ عرصہ تک وکالت کر کے قانون سے واقف اور حالاتِ رعایا سے باخبر ہو چکے ہوں چنانچہ عہدہ داروں کے تقرر کے قواعد میں ترمیم کر دی گئی اور عدالت کے ادنےٰ درجہ کے عہدہ دار منصف (مجسٹریٹ) کے لئے یہ شرط لگادی گئی کہ یا تو حیدرآباد کی سول سروس کلاس کا کامیاب شدہ ہو یا کم از کم ایک سال تک علاقہ انگریزی میں کام سیکھا ہو یا ایسا شخص ہو جس نے اپنی قابلیت کیوجہ سے سرکاری وظیفہ حاصل کر کے یورپ میں تعلیم پائی ہو یا ایل۔ ایل بی کا امتحان پاس کرنے کے بعد دو سال تک وکالت کی ہو۔ اسی معیار سے اعلیٰ خدمتوں کے لئے شرائط عائد کی گئی تھیں اور اعلیٰ عہدوں پر صرف تعلیم یافتہ اور قابل لوگوں کا انتخاب عمل میں لایا جاتا تھا۔ ان کو بیش قرار تنخواہیں دی جاتی تھیں تاکہ وہ ناجائز طریقوں سے اپنی آمدنی

میں اضافہ نہ کر سکیں ۔

حضور نظام کو اسلامی روایات اور اسلامی قانون سے حد درجہ عشق تھا چنانچہ عدالت العالیہ میں ججوں کی جماعت کے ساتھ ایک مفتی بھی ہوا کرتا تھا۔ اسلامی فقہ، حدیث اور شریعت کی اعلیٰ قابلیت رکھنے والے شخص کو اس عہدے کے لئے منتخب کیا جاتا تھا۔ ہائی کورٹ کے کسی فیصلے پر حضور نظام کی توثیق سے پہلے مفتی شہر سے اسلامی شریعت اور فقہ کی روشنی میں اس فیصلے پر مشورہ طلب کیا جاتا تھا۔ اگر ہائی کورٹ کسی ملزم کو "موت کی سزا" کا مستوجب قرار دیتا تو حضور نظام کی منظوری سے پہلے مفتی شہر کی اجازت ضروری قرار دی گئی تھی۔

مطلق العنان بادشاہت کے دور میں اسلامی قانون اور فقہ کا یہ احترام حضور نظام کے سچے مسلمان ہونے کا ثبوت ہے۔ کس قدر تعجب اور حیرت کا مقام ہے کہ حضور نظام ۱۹۱۱ء سے ۱۹۴۸ء تک ایک بادشاہ کی حیثیت سے حکومت کرتے رہے لیکن اس ۳۷ سالہ دور میں کسی ملزم کو بھی موت کی سزا نہیں دی گئی۔ اعلیٰ حضرت نے اپنے فطری جذبۂ رحم کے تحت سزائے موت کو عمر قید میں بدل دیا کرتے تھے اور اپنی سالگرہ کے موقعہ پر

عمر قید پانے والے ملزموں کو رہا کر دیتے تھے۔

حضور نظام کے دور میں جرائم کی اس قدر کمی ہو گئی تھی کہ ریاستِ حیدرآباد دیگر ممالک کے لئے قابلِ تقلید بن گئی تھی چنانچہ اس کی بازگشت برطانوی پارلیمان میں بھی سنائی دی جانے لگی اور سزائے موت کو موقوف کرنے کے لئے حیدرآباد کی نظیر پیشِ نظر رکھی گئی۔ حیدرآباد دکن میں سزائے موت کی موقوفی کے بعد برطانوی حکومت کو ایسا قانون نافذ کرنے میں ایک ربع صدی کا عرصہ درکار ہوا۔

# محکمہ امور مذہبی

حکومتِ حیدرآباد سرکارِ عالی کے نظم و نسق میں سررشتہ امور مذہبی ایک عظیم اور اہم سررشتہ ہے اور علی العموم ہر مہذب سلطنت اس کی اہمیت اور ضرورت کو تسلیم کرتی ہے۔ بلادِ اسلامیہ میں یہ سررشتہ اپنی نوعیت اور کارکردگی کی بناء پر پہلا سررشتہ ہے اس محکمہ نے جو خدمات انجام دیں وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ ہر فلاحی مملکت کو اس کی تقلید کرنی چاہیے۔

حکومتِ حیدرآباد میں زمانہ قدیم سے دفتر صدارت العالیہ امور مذہبی اور اوقاف سے متعلق فرائض انجام دیتا تھا۔ بہت سے تغیرات کے بعد بالآخر امور مذہبی اور اوقاف کا شعبہ علحدہ ہوکر محکمہ امور مذہبی قائم ہوا جو ایک طرف مسلمانوں کی مذہبی اصلاح امور مساجد کا انتظام اور اہل ہنود کے معابد کا انتظام، اہلِ خدمات مذہبی کے کام کی نگرانی اور ان کی اصلاح اور دیگر مذہبی امور کا التزام، اوقات کا تحفظ کرنا ہوتا تھا اور دوسری طرف مختلف مذاہب میں خوشگوار تعلقات برقرار رکھنے کی کوشش کرنی پڑتی تھی۔

**سررشتہ مذہبی کے فرائض:۔** اس محکمہ کے فرائض حسب ذیل شعبوں

پر تقسیم کئے جاتے تھے۔

۱۔ تحقیقات و انتظام وصیایت جائداد ہائے موقوفہ و اماکن مذہبی۔

۲۔ انتظام و نگرانی معاشہائے مشروط۔

۳۔ انتظام و نگرانی فرائض اہل خدمات مذہبی۔

۴۔ تعمیر و ترمیم اماکن مذہبی۔

۵۔ انتظام تقاریب مذہبی۔

۶۔ انتظام اصلاح مذہبی اہلِ اسلام

۷۔ انتظام و نگرانی مدارس و کتب خانہ جات متعلق محکمہ امور مذہبی۔

۸۔ انتظام روانگی قافلہ حجاج۔

۹۔ مذہبی نزاعات کا رفع کرنا اور مختلف المذاہب رعایا میں خوشگوار تعلقات کا قیام۔

اس محکمہ کے مصارف لاکھوں روپے سالانہ منظور کئے جاتے تھے۔ اہل اسلام اور اہل ہنود کے علاوہ عیسائیوں کے معابد کے لئے نہ صرف نقد رقم دی جاتی تھی۔ بلکہ ہزاروں ایکر زمین وقف کر دی گئی تھی۔

محکمہ امور مذہبی کے زیر انتظام دینی تعلیم کے لئے بیسیوں مدارس قائم کئے گئے، جہاں عربی زبان کے علاوہ فقہ اور حدیث کی تعلیم دی جاتی تھی، حفظِ قرآن مجید کے لئے مدارس موجود تھے۔ طالب علموں کو ماہانہ وظائف

مقرر تھے اور فارغ التحصیل ہونے کے بعد طلباء کو خلعت سلطانی عطا کیا جاتا تھا۔ اسی محکمہ کے زیر انتظام مختلف محلّوں میں دار المطالعہ کھولے گئے تھے۔ جہاں دار القضاہ کی کتابیں وافر تعداد میں فراہم کی گئی تھیں۔ مساجد کی تعمیر و ترمیم کے علاوہ امام اور موذن صاحبان کو اس محکمہ کی جانب سے تنخواہیں مقرر تھیں۔ یہ امام اور موزن صاحبان کسی دیہات سے پکڑ کر نہیں لائے جاتے تھے بلکہ ان کی قابلیت کا امتحان لیا جاتا تھا۔ انھیں مقررہ نصاب کی تکمیل کرنی پڑتی تھی۔ ان کو اصلاحی کام کیلئے بھی تیار کیا جاتا تھا۔ اور علمی معلومات کے ساتھ تقریر اور وعظ میں مہارت پیدا کرائی جاتی تھی۔

**حجاج :۔** ہر سال مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد حج کرنے کے سعادت حاصل کرتی تھی۔ حکومت کی۔ جانب سے تعداد کی کوئی حد مقرر نہیں تھی۔ حجاج کے قافلہ کی روانگی کے سارے انتظامات حکومت کے ذمہ تھے حجاج کی سہولتوں کا پورا خیال رکھا جاتا تھا۔ ایک قافلہ سالار مقرر کیا جاتا تھا جس کے ساتھ ڈاکٹروں کی ایک جماعت ہوتی تھی جو حجاج کی صحت اور دیگر ضروریات کا خیال رکھتی تھی مکہ معظمہ میں ان حاجیوں کی رہائش کیلئے لاکھوں روپے کے خرچ سے رباط تعمیر کئے گئے تھے۔ اہل مدینہ و اہل مکہ کی امداد کے لئے لاکھوں روپے بھجوائے جاتے تھے۔

# کتب خانہ آصفیہ

یہ کتب خانہ نہ صرف اپنی عربی وضع کے باعث بلکہ اپنے نوادراتِ کتب کی وجہ سے بھی دنیا کے کتب خانوں سے کسی طرح کم نہیں تھا۔ کتب خانہ آصفیہ میں عربی، فارسی اور دیگر زبانوں کی نایاب قلمی و مطبوعہ کتب کا وافر ذخیرہ تھا۔

کتب خانہ آصفیہ کے علاوہ اہل حیدرآباد کے بہت سے خانگی کتب خانہ بھی ایسے تھے جن کو دیکھنے دیگر ممالک کے لوگ آیا کرتے تھے۔ یورپ اور امریکہ کے قدردانوں نے روپیہ پیسہ کا لالچ بتاکر جب ان خانگی کتب خانوں سے نوادرات علم کو خریدنا شروع کر دیا۔ تو حضور نظام نے ایک فرمانِ مبارک کے ذریعہ ان قیمتی خزانوں کی خریداری کا عام اعلان کروا دیا۔ جس سے علمی خزانے محفوظ ہوگئے۔

رودِ موسیٰ کے کنارے عربی وضع کی خوبصورت عمارت دو لاکھ پچاس ہزار کے صرفہ سے تعمیر ہوئی۔

# دواخانہ عثمانیہ

رودِ موسیٰ کے دونوں جانب جو خوبصورت عمارات تعمیر کی گئی تھیں۔ ان میں دواخانہ عثمانیہ کی عمارت بھی شامل ہے یہ عمارت جو سہ منزلہ ہے چوبیس لاکھ روپئے کے صرفے سے تعمیر کی گئی اور اپنی نوعیت کے اعتبار سے ہندوستان میں دوسرے نمبر پر ہے۔ اس دواخانہ کو حضور نظام ہی کے نام سے موسوم کیا گیا تھا۔ اس دواخانہ میں مختلف امراض کے علاج کے لئے نہایت قابل ڈاکٹروں کا انتخاب عمل میں آیا۔ ڈاکٹروں کو تربیت کے لئے یورپ اور لندن کی درسگاہوں میں بھیجا گیا اور ان ڈاکٹروں میں اکثریت نے عالمگیر شہرت حاصل کی۔ اس دواخانے میں طریقہ علاج انگریزی تھا۔

# نظامیہ یونانی شفاخانہ

شہرِ حیدرآباد کے قلب میں قطب شاہی سلاطین کی بنائی ہوئی مکہ مسجد اپنی خوبصورتی کے باعث اقصائے ہند میں مشہور ہے۔ مکہ مسجد کے بالمقابل چار مینار بھی قطب شاہی سلاطین کی عظمت کی گواہی دیرہا

ہے۔ ان دو عمارات کے مقابل ایک اور خوبصورت عمارت بنائی گئی تھی جو شفاخانہ یونانی کے نام سے موسوم ہے۔ اس شفاخانہ میں طریقہ علاج یونانی ہے اور ہندوستان کا پہلا طبیہ کالج بھی اسی عمارت میں واقع ہے۔ طبیہ کالج اپنی نوعیت کے اعتبار سے پہلا کالج ہے۔ جہاں طب مشرقی کی تعلیم دی جاتی تھی اور تحقیقاتی کام کیا جاتا تھا۔ اس شفاخانہ میں چوٹی کے اطباء کو بیش قرار تنخواہیں دی جاتی تھیں اور یہ اطباء اپنی قابلیت کے باعث بیرون دکن بھی مشہور و معروف ہوگئے تھے۔ اس شفاخانے کی عمارت پانچ لاکھ بتیس ہزار کر دیے کی لاگت سے تعمیر کی گئی تھی۔

اس صدر شفاخانہ کے علاوہ شہر کے محلوں میں بھی شفاخانے قائم تھے جن کی تعداد نئی بستیوں کے بسنے کے ساتھ ساتھ بڑھتی چلی گئی تھی۔

متعدی امراض کے علاج کے لئے بھی علٰحدہ دواخانے قائم کئے گئے چنانچہ مرضِ دق کے دواخانے ایک لاکھ روپے کے صرفے سے تعمیر ہوئے۔ مرضِ دق کے علاج کے لئے صحت افزا مقام ضلع وقار آباد میں ایک سینی ٹوریم دس لاکھ روپے کی لاگت سے تعمیر کیا گیا۔

# عثمانیہ عدالت العالیہ

رودِ موسیٰ کے ایک کنارے پر کتب خانہ آصفیہ اور عثمانیہ دواخانہ کی دلکش عمارتیں واقع ہیں اور دوسرے کنارے پر عثمانیہ عدالت العالیہ (ہائی کورٹ) کی پرشکوہ عمارت ہے جو اپنی خوشنمائی، خوبصورتی اور فنِ تعمیر کے نقطہ نظر سے بے نظیر ہے۔ اس عمارت کی تعمیر میں گرانائیٹ پتھر استعمال کیا گیا ہے اس کی تعمیر میں اکیس لاکھ اکیس ہزار روپیہ خرچ کیا گیا۔

## سٹی کالج

عثمانیہ عدالت العالیہ سے متصل ایک اور دانش گاہ تعمیر کی گئی جو سٹی کالج کے نام سے مشہور ہے اس درسگاہ کی عالیشان عمارت نو لاکھ چوبیس ہزار روپے کی لاگت سے تعمیر کی گئی۔

ان عمارات کے علاوہ حسب ذیل جاذب نظر عمارات بھی تعمیر کی گئیں۔

| عمارت | | لاگت |
|---|---|---|
| نمائش گاہ باغ عامہ | = | ایک لاکھ ستر ہزار روپے |
| جوبلی ہال | = | ساڑھے تین لاکھ ” |
| جوبلی پویلین | = | ڈیڑھ لاکھ ” |
| قصرِ شاہی واقع دہلی۔ | = | تیس لاکھ ” |

# زراعت

زراعت کے معاملہ میں ریاستِ حیدرآباد کو ہندوستان میں نہایت اہم حیثیت حاصل ہے۔ حیدرآباد زرعی اجناس میں نہ صرف خودکفیل تھا بلکہ مختلف اجناس برآمد کی جاتی تھیں۔ بے شمار اجناس مثلاً جوار، ارنڈی، مونگ پھلی اور دالوں کے لحاظ سے حیدرآباد بہت مشہور تھا۔ حضور نظام نے اپنی ریاست کو زراعت میں خودکفیل بنانے کیلئے زراعت کا مستقل محکمہ قائم کیا۔ زراعت کی اعلیٰ تعلیم کے لئے حکومت کے خرچ پر طلباء کو یورپ کے ملکوں میں بھیجا جاتا تھا۔ ایک جامع منصوبے کے تحت زراعت کو اس قدر ترقی دی کہ حیدرآباد خوشحال ملک بن گیا تھا۔ ۱۹۴۸ء میں ہندوستان نے معاشی ناکہ بندی کر دی تھی۔ لیکن اس کے باوجود دکن میں رعایا کو وافر مقدار میں اجناس ملتے رہے۔

سررشتہ زراعت کے کام کی تقسیم تین مدات میں کی گئی۔

(۱) تحقیقات (۲) آزمائش (۳) تبلیغ۔

زرعی ترقی کے لئے ریسرچ کا ایک شعبہ قائم کیا گیا۔ سائنٹفک اصولوں کی روشنی میں جدید قسم کی فصلیں اُگائی گئیں۔ کیمیاوی کھاد اور افزائشِ نسل حیوانات کے شعبے قائم کئے گئے۔ بڑے پیمانے پر

مزرعہ جات اور باغات لگائے گئے جہاں جدید کاشت کے طریقوں اور کھادوں کے تجربے کئے جاتے تھے. عہدہ دار مواضعات میں دورے کر کے کاشتکاروں کی ضروریات سے آگاہی حاصل کرتے تھے اور انھیں کھاد اور بیجوں اور دیگر ضروری اشیاء کی فراہمی میں انکی مدد کرتے تھے. جدید طریقہ کاشت سے ان کو واقف کروایا جاتا تھا تاکہ فصلیں عمدہ ہوں.

کاشتکاروں اور دوسرے پیشہ وروں مثلاً پارچہ بافوں، تجاروں اور کاغذ یاروں کو مالی امداد دینے کے لئے ایک محکمہ امداد باہمی قائم کیا گیا تھا. جس کی بنیاد امدادِ ذاتی کے اصول پر رکھی گئی تھی. کاشتکاروں کو ساہوکاروں اور مہاجنوں کے قرضوں سے محفوظ رکھنے کے لئے حکومت قرض اور امداد دیا کرتی تھی. کاشتکاروں کو عمدہ بیج اور مویشی فراہم کئے جاتے تھے.

ریاست میں نہروں کا جال بچھا دیا گیا تھا. لاکھوں روپے کے خرچ سے بے شمار تالاب اور نہریں بنائی گئی تھیں - ہر ضلع میں آبپاشی کے لئے کنویں، نہریں اور تالاب بنائے گئے. دریاؤں کو روک کر ان پر بڑے بڑے بندھ باندھے گئے اور ان سے نہریں نکال کر بے آب زمینوں کو سیراب کیا جاتا تھا.

# تعلیمات

تاجدارِ دکن میر عثمان علی خاں کی اورنگ نشینی کے وقت ریاست میں صرف دو کالج تھے۔ ایک انگریزی تعلیم کا دوسرا مشرقی تعلیم کا۔ مدارس کی تعداد بھی نہایت محدود تھی۔ صنعتی اور فنی تعلیم کی طرف تو بہت ہی کم رجحان تھا۔ اعلیٰحضرت کی تخت نشینی کے بعد علم کی دنیا میں انقلاب آگیا۔ اس علم پرور بادشاہ نے سارے ملک میں مدرسوں اور کالجوں کا جال بچھا دیا۔ اس محکمہ کو وسعت بخشی اور ہندوستان کے کونے کونے سے ماہرینِ تعلیم کی خدمات حاصل کیں انھیں بیش قرار تنخواہیں دی گئیں اور ان کے مشوروں پر عمل کیا گیا۔ حضور نظام نے اپنی رعایا کو زیورِ علم سے آراستہ کرنیکے لئے اپنے خزانے کے دروازے کھولدے اور کروڑوں روپیہ کے صرفہ سے مدارس اور کالج کھولے اور یونیورسٹی قائم کی۔

سب سے پہلے ابتدائی تعلیم عام کر دی گئی۔ نہ صرف شہروں اور قصبات بلکہ گاؤں گاؤں میں مدارس تحتانیہ قائم کئے گئے اور ملک کی چاروں زبانوں اردو، تلنگی، مرہٹی اور کنڑی میں تحتانی تعلیم کے انتظامات کئے گئے نیز قانون کے ذریعہ ابتدائی تعلیم کو مفت کر دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی مدارس وسطانیہ اور فوقانیہ بڑی تعداد میں کھولے گئے۔ کارآمد

مضامین کو شریک نصاب کیا گیا۔ دستی مشاغل (مختلف پیشوں کی تعلیم مثلاً بخاری، جلد سازی وغیرہ) تمام مدارس میں رائج کئے گئے۔

ابتداءً اعلیٰ تعلیم کے لئے حیدرآباد میں صرف دو کالج قائم تھے ایک دارالعلوم (علوم مشرقیہ) جس کا الحاق جامعہ پنجاب سے تھا اور دوسرا نظام کالج تھا جس کا الحاق جامعہ مدراس سے تھا۔ لیکن بعد میں نہ صرف شہر حیدرآباد میں کھولے گئے بلکہ اضلاع میں بھی کالج قائم کئے گئے۔ اِن مدرسوں میں تعلیم کا معیار بہت اعلیٰ تھا اور قومی ضروریات کی تکمیل کرتا تھا۔ ان سینکڑوں مدارس اور کالجوں کا انتظام محکمہ تعلیم کے سپرد تھا۔ اس محکمہ کا سب سے بڑا عہدہ ایسے شخص کو دیا جاتا تھا جو خود ماہرِ تعلیم ہوتا تھا۔ چنانچہ نظامت تعلیمات پر الما لطیفی، خاں فضل محمدؐ خاں اور سر راس مسعود جیسی شخصیتوں کا تقرر کیا گیا جن میں نہ صرف انتظامی امور کی بیش بہا صلاحیتیں تھیں بلکہ جو خود ملکی اور قومی تقاضوں اور حب الوطنی کے جذبے سے مالا مال تھے۔ ان حضرات نے جو خدمات انجام دیں ان کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

پست اقوام جو چھوت چھات کے خیالات اور اپنی معاشی اور سماجی پستی کی وجہ سے سابق میں تعلیم سے سراسر محروم تھے وہ بھی اعلیٰحضرت کے مبارک عہد میں زیورِ علم سے آراستہ ہونے لگے۔ جاگیرداروں کے طبقے کے لئے جو تعلیم سے عموماً بھاگتے تھے ایک نہایت شاندار اور

ترقی یافتہ درسگاہ جاگیردار کالج کے نام سے قائم ہوئی جس پر اس طبقہ کے نونہالوں کو اقامت کے ساتھ ساتھ تربیت بھی دی جاتی تھی۔ حضور نظام کا طفیل ہے کہ جاگیرداروں کی اولاد نے اس دور میں جو تعلیم حاصل کی اس کے باعث آج جبکہ جاگیرداری نظام ختم ہوگیا باعزت زندگی گزارنے کے قابل بن گئی۔ ان درسگاہوں کے علاوہ ملکی صناع، گل کاری، برقیات، انجنیرنگ طب قدیم اور قانون کی تعلیم کے لئے بھی مختلف درسگاہیں۔ اس دور کی ایک نمایاں خصوصیت ہے۔ اساتذہ کو جدید طریقہ ہائے تعلیم سے آگاہ کرنے کے لئے اور ان کی کارکردگی کو بہتر بنانے کے لئے ٹیچرز ٹریننگ کالج (کلیہ معلمین) قائم کیا گیا۔

عہد عثمانی میں تعلیم نسواں کی جانب بھی پوری توجہ کی گئی۔ لڑکیوں کے لئے بے شمار مدارس کھولے گئے۔ ایک زنانہ کالج اور چار مدارس تعلیم المعلمات (استانیوں کا ٹریننگ کالج) قائم کیا گیا۔ طالبات اور معلمات کے لئے پردے کی سواریوں کا خاطر خواہ انتظام تھا۔ مدارس میں مخلوط تعلیم کا رواج بالکل نہیں تھا۔

ملک کے چہرے سے جہالت کا بدنما داغ دور کرنے کے لئے تعلیم بالغان کی بھی ایک وسیع اسکیم کو نافذ کیا گیا اور تقریباً پچھتر ایسے مدرسے قائم کئے گئے جو پختہ عمر کے لوگوں کو مفت ابتدائی تعلیم دیتے تھے۔ ان کے

اوقات بطور خاص ایسے مقرر کئے گئے کہ ملازمت پیشہ افراد اپنا پڑھنا سیکھ سکتے تھے۔

وہ بدنصیب بندگانِ خدا جو نابینائی۔ عدم گویائی اور ثقلِ سماعت کی نعمتوں سے محروم ہوتے تھے ان کے لئے بھی تعلیم کا انتظام کیا گیا تھا۔ سرکاری اسکولوں کے علاوہ خانگی مدارس بھی تھے حکومت ان کی مالی اعانت کرتی تھی۔ سرکاری اسکولوں میں تحتانی جماعتوں میں فیس معاف تھی۔ ثانوی مدارس میں فیس برائے نام تھی۔ میٹرک یا دسویں جماعت میں صاحب حیثیت لڑکے ایک روپیہ ۲ آنے فیس دیا کرتے تھے۔ طلباء کی ایک بڑی تعداد کی نہ صرف فیس معاف تھی بلکہ حکومت انھیں وظائف بھی دیا کرتی تھی۔ کالج اور یونیورسٹی میں ڈگری کلاسوں کی فیس چھ روپے ماہانہ تھی علم کی اس فراوانی کا یہ نتیجہ ہے ملک سے جہالت دور ہوگئی۔ امیروں کے علاوہ غریب اور نادار طبقہ کی اولاد نے بھی علم کی دولت حاصل کی۔ ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی اور پارسی غرضکہ ہر مذہب اور قوم کے بچوں پر علم کے دروازے کھولدیئے گئے۔ پست اقوام اور غریب و نادار طبقہ نے خصوصیت سے اتنا فائدہ اٹھایا کہ انکی اولاد آج حضور نظام کے طفیل اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے اعلیٰ عہدوں پر متمکن ہیں۔ ان میں ڈاکٹر بھی ہیں اور انجینیر بھی ہیں ایک مطلق العنان اور دولتمند بادشاہ نے علم وفن کی جو خدمت کی اور جو نسل انسانی پر جو احسان کیا ہے تاریخ اس کو کبھی نہیں بھلا سکتی۔

# عطیاتِ سلطانی

ہندوستان کے بیشتر علمی اور ادبی ادارے حضور نظام کی بیش بہا امداد کے سہارے قائم تھے۔ مساجد، منادر اور دیگر مذہبی اداروں کو سالانہ امداد مقرر تھی۔ شرفاء کے گھرانے حضور نظام کے وظائف پہ زندگی گزارتے تھے۔ جس وقت بھی اور جہاں کہیں سے امداد کے لئے درخواست کی گئی حضور نظام نے بلا پس وپیش لاکھوں روپے کی امداد دی۔ مشرقی علوم کے مدارس ہوں، سائنسی و فنی علوم کے انسٹیٹیوٹ ہوں، مذہبی عبادت گاہیں ہوں یا کتب خانے حضور نظام کی بروقت اور بیش بہا اعانت سے فیض پاتے تھے۔

وہ تعلیمی ادارے جو شہریارِ دکن کی گراں بہا امداد سے فیض پاتے تھے درج ذیل ہیں۔

علیگڈھ یونیورسٹی، بنارس یونیورسٹی، ٹیگور کا شانتی نکیتن۔ کلکتہ، انجمن حمایت الاسلام لاہور، دارالعلوم دیوبند، دالمصنفین ندوہ، دارالعلوم سہارنپور، دارالعلوم رامپور، کتب خانہ اللہ بخش پٹنہ،

رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن، مدرسہ اسلامیہ سکندر آباد، دارالاشاعت اسلامی، برار، اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ، مسلم لیبوریٹری ابنالہ، حالی میموریل ہائی اسکول پانی پت، انجمن اسلامیہ بمبئی، لیڈی ہارڈنگ کالج، انجمن اسلامیہ شملہ، انجمن اسلامیہ مدراس، ڈیرہ دون کالج، انجمن ترقی تعلیم مسلمانان امرتسر۔ بدایوں، دہلی اور افغانستان کے شرفاء کو وظائف مقرر تھے۔

خلیفۃ المسلمین سلطان عبدالحمید خاں والیٔ ترکی کی معزولی کے بعد ۱۹۲۴ء میں حضور نظام نے تین سو پونڈ ماہانہ تاحیات پنشن جاری کر دی تھی۔"

حضور نظام علامہ اقبال کے مداحوں میں سے تھے۔ علامہ اقبال دکن کو اسلامی اقتدار کا مظہر اور اعلیٰ حضرت کو سطوتِ دینِ مبین کی یادگار سمجھتے تھے۔ حضور نظام نے علامہ اقبال کے نام ایک معقول رقم بطور وظیفہ جاری کر دی تھی۔

منشی ذکاءاللہ مؤلف فرہنگ آصفیہ، کو معقول رقم وظیفہ کے طور پر دی گئی۔ فرہنگ آصفیہ، کی تدوین اور اشاعت کے لئے ہزاروں روپیہ خرچ کیا۔

مولوی بشیرالدین صاحب، ایڈیٹر البشیر ہائی اسلامیہ اسکول اٹاوہ کے نام

معقول وظیفہ جاری کیا۔

ابوالاثر حفیظ جالندھری کو بھی تین سو روپیہ ماہانہ وظیفہ مقرر کر دیا تھا علامہ شبیر احمد عثمانی بھی حضور نظام کے وظیفہ خوار تھے۔ وقار الملک مولوی مشتاق حسین نے اپنے لڑکے کی اعلیٰ تعلیم کے لئے وظیفہ کی درخواست کی۔ اعلیٰحضرت نے ہندوستان میں تعلیم کے لئے سو روپیہ اور یورپ میں تعلیم کے لئے ڈھائی سو روپیہ ماہوار منظور فرمائے (زمانہ جنگ میں وظیفہ میں اضافہ فرمایا) اس کے علاوہ مرحوم کے دو نواسوں کا وظیفہ بھی مقرر ہوا اور سو روپیہ کا وظیفہ ان کی بیگم کو مرحمت فرمایا۔

## قرآن مجید کے ترجموں اور سیرۃ نبوی کی اشاعت کیلئے امداد۔

علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ نے جب سیرۃ نبوی کی اشاعت کا قصد کیا تو اعلیٰحضرت حضور نظام نے انہیں ایک معقول رقم دی اور ایک مستقل ماہوار وظیفہ ادارہ سیرت نبوی اعظم گڑھ کو دیا جاتا رہا۔

مارماڈیوک پکتھال کو قرآن مجید کے انگریزی ترجمہ کے لئے ہزاروں روپے دئے، ایک لمبے عرصہ کے لئے پوری تنخواہ پر انھیں رخصت دی اور ترجمہ کے سلسلے میں قیام مصر وغیرہ کے اخراجات ادا کئے۔

شیخ محمد یوسف صاحب ایڈیٹر "نور" قادیان کو قرآن مجید کے گورمکھی ترجمہ کے لئے پورے اخراجات دئے۔

حکیم محمد یعقوب صاحب نے قرآنِ مجید کا گجراتی ترجمہ کیا۔ اس ترجمہ کی اشاعت کے لئے حضور نظام نے ایک کثیر رقم دی اور اس کے ساتھ ۵۰ روپے ماہوار تاحیات پنشن مقرر کی۔

## دیگر امدادیں:-

جنگِ بلقان ۱۹۱۳ء میں انجمن ہلالِ احمر ترکی کو پچاس ہزار روپیہ کا عطیہ مرحمت فرمایا۔

مظلومین و بے خانماں اہل سمرنا (ترکی) کی امداد کے لئے ایک لاکھ روپے مرحمت فرمایا۔

لندن کی مسجد کی تعمیر کے لئے آٹھ لاکھ روپے دیئے۔ ووکنگ مسجد اور MUZLIM MOQUE اور پول (انگلینڈ) کی تعمیر کے لئے گراں قدر عطیہ دیا۔

## بھاؤنگر کا قحط۔

۱۳۳۰ھ کے آخر میں ریاست بھاؤنگر میں قحط زدہ لوگوں کی امداد کے لئے پانچ ہزار کی رقم عطا فرمائی۔

## جنوبی افریقہ کے ہندوستانی مصیبت زدوں امداد۔

۱۳۳۳ھ میں جنوبی افریقہ میں مقیم ہندوستانی مصیبتِ آلام ہوئے تو اعلیٰ حضرت نے دس ہزار سکہ انگریزی کی رقم عطا فرمائی۔

## لکھنو کی طغیانی :-

سنہ ۱۳۲۳ھ میں لکھنؤ میں دریا کی طغیانی کی وجہ سے ہزاروں خاندان متاثر ہوئے۔ اعلیحضرت نے ان کی امداد کے لئے دس ہزار سکہ انگریزی کا عطیہ دیا۔

## زنانہ ریلیف فنڈ بمبئی :-

بمبئی میں زنانہ ریلیف فنڈ کی ایک شاخ جو مصیبت زدگان کی امداد کے لئے قائم کی گئی تھی اعلیحضرت نے پانچ ہزار کی رقم بطور امداد بھجوائی۔

## لیڈی ہارڈنگ میڈیکل کالج ہسپتال۔ دہلی

مذکورہ بالا ہسپتال کی امداد کے لئے ایک لاکھ روپیہ کا عطیہ دیا۔

## حاجیوں کی امداد :-

سنہ ۱۳۲۵ھ میں نادار حاجی جو بوجہ افلاس جدّہ میں پڑے تھے ان کی واپسی کے لئے ایک فنڈ کی تجویز ہوئی تو اعلیٰحضرت نے دس ہزار سکہ انگریزی کا عطیہ دیا۔

## مسلمانانِ بہار کی امداد :-

سنہ ۱۳۳۶ھ میں بہار کے مصیبت زدہ مسلمانوں کی امداد کے لئے ایک ایک لاکھ روپیہ کا عطیہ دیا۔

سنہ ۱۹۲۰ء میں لیڈی چیمسفورڈ کی مجوزہ یتیم بچوں کے فنڈ میں پچاس ہزار

روپیہ مرحمت فرمایا

وسط فروری ۱۹۲۲ء میں لیڈی ریڈنگ کے خواتین کے فنڈ میں پچیس ہزار روپیہ کا عطیہ دیا۔

## ملبار کے مصیبت زدگان کی امداد:۔

۱۳۴۱ھ میں مصیبت زدگان مالابار کی اعانت کے لئے پچاس ہزار روپیہ عنایت کیا۔ آخر ماہ ذی الحجہ ۱۳۴۲ھ میں مالابار کے موپلاؤں کی امداد کے لئے پچاس ہزار کا فیاضانہ عطیہ دیا۔ اس رقم سے مالابار میں یتیم خانہ اور گھریلو صنعتی کارخانے قائم کر کے بیوگان اور یتامیٰ کی پرورش کا سامان کیا گیا۔ پھر اوائل محرم ۱۳۷۳ھ میں مالابار میں طغیانی سے متاثرہ لوگوں کی مدد کے لئے پچیس ہزار روپیہ بطور امداد دئے۔

## کلکتہ کے مسلم یتیم خانہ کی امداد:۔

ربیع الاول ۱۳۴۳ھ میں مذکورہ یتیم خانہ کی امداد کے لئے دس ہزار اور پھر ماہ جمادی الاول میں مزید دس ہزار روپیہ عنایت کیا۔

## جاپان کے مصیبت زدگان کی اعانت:۔

ماہ نومبر ۱۹۱۳ء میں مصیبت زدگان جاپان کی تیس ہزار روپیہ کی مدد کی۔

## جنگ مراکش کے متاثرہ لوگوں کی امداد:۔

شعبان ۱۳۴۳ھ میں مراکو کی جنگ میں مقتولین اور مجروحین کی بیواؤں

اور بچوں کی امداد کے لئے پانچسو پونڈ بھوائے۔

## فلسطین کے زلزلہ زدگان کی امداد:۔

۱۳۴۶ء میں فلسطین کے زلزلہ زدگان کی امداد کے لئے ایک ہزار پونڈ کی رقم عطا فرمائی فلسطین کے عرب مہاجرین کے لئے لاکھوں روپیہ کا عطیہ دیا۔

بیت المقدس کے زاویہ الہنود (مسافرین اور زائرین کی قیام گاہ) کی مرمت کے لئے پانچہزار روپیہ عنایت فرمایا۔

## ہسپتال کے لئے عطیہ:۔

جنوری ۱۹۳۱ء میں ملک معظم کے نام سے موسوم ہسپتال کے لئے ۲ لاکھ پونڈ کا عطیہ دیا۔

حضور نظام کو پاکستان سے بے حد محبت تھی اور وہ ہمیشہ پاکستان کی فلاح وبہبود اور ترقی میں دلچسپی لیتے رہے۔ چنانچہ اگست ۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند کے بعد حکومتِ ہند نے پاکستان کے حصہ میں آنے والی رقم کو روک لینے کا فیصلہ کیا تاکہ پاکستان اپنے پیروں پر کھڑا نہ ہوسکے تو میر لائق علی وزیر اعظم حیدرآباد دکن نے حضور نظام کے سامنے تجویز پیش کی کہ ایسے نازک لمحہ میں پاکستان کی مدد کے لئے دس کروڑ روپیہ منظور کئے جائیں تو حضور نظام نے اس سے دگنی

رقم (بیس کروڑ) روپے منظور کئے اور مزید امداد کا اعلان کیا۔ حکومت ہند کو اس عطیہ کا علم ہوا تو گاندھی جی نے سارے عالم میں رسوائی اور ذلت کے خوف حکومت ہند کو پاکستان کے حصے میں آنے والی رقم جلد از جلد ادا کرنے کا مشورہ دیا۔

---

# شہریارِ دکن اور نواب بہادر یار جنگ

لسان الامت نواب بہادر یار جنگؒ نے مختلف موقعوں پر حضور نظام کے متعلق اپنے ان تاثرات کا اظہار فرمایا:۔

"ہم دکن کے بادشاہ ہیں، اعلیٰحضرت کا تخت و تاج ہمارے سیاسی اور تمدنی اقتدار کا مظہر ہے، اعلیٰحضرت ہماری بادشاہت کی روح ہیں اور ہم ان کی بادشاہت کا جسم، اگر وہ نہیں تو ہم نہیں اور ہم نہیں تو وہ نہیں"

(سیاسی تقاریر)

ایک مرتبہ "جمال الدین افغانی" پر تقریر کرتے ہوئے نواب صاحب نے فرمایا:۔

"جمہوریت کا وہ شیدائی اور عمومیت کا وہ فدائی جو قاچار کو قتل کرنے، خدیو اسمٰعیل کو ختم کرنے کے منصوبے گانٹھ رہا ہو اور جس کو دنیا آج بھی شہنشاہیت اور ملوکیت کا دشمن تصور کرتی ہو، حیدرآباد آتا ہے اور دو سال حیدرآباد میں رہتا ہے۔ اس وقت کیا حیدرآباد اپنی موجودہ حالت میں نہ تھا؟ کیا بلارم والوں کی چھاؤنیاں

اس وقت انگریزی فوجوں سے خالی تھیں؟ کیا اس وقت حیدرآباد میں انگریزی ریذیڈنسی قائم نہ ہوئی تھی؟ اور کیا حیدرآباد میں اس وقت ایک با اقتدار ملوکیت کام نہیں کر رہی تھی۔ پھر کیا وجہ ہے کہ شہنشاہیت کا دشمن، ملوکیت کا قاتل جمال الدین افغانی دو سال حیدرآباد میں رہتا ہے۔ اور اس ملوکیت کے خلاف ایک لفظ نہیں کہتا۔"

(سیاسی تقاریر)

۱۹۴۳ء میں جب بہادر یار جنگؒ کی زبان بندی کی مدت ختم ہوئی اور کہنے کا موقع ملا تو دارالسلام کے بھرے مجمع میں یہ اعلان ہوا:۔

"خوب یاد رکھیں میں اس کا دوست نہیں ہوں۔ جو مسلمانانِ دکن کے اقتدار سیاسی و تمدنی کے مظہر اعلیٰحضرت شاہ دکن و برار سے غیر متزلزل وفاداری و عقیدت نہیں رکھتا، میرا ہاتھ اس کی آنکھیں نکال لیگا جو ان کی طرف ٹیڑھی نظر سے دیکھے، اس کی زبان کھینچ لے گا جو ان کی شان میں ناشائستہ حرکت کا ارادہ کرے۔

وہ ہماری سیاست کے محور ہیں اور ان کے استحکام و بقاء پر ہمارے استحکام انحصار ہے"۔ (رہبرِ دکن، مارچ ۱۹۴۴ء)

اعلیٰحضرت نے نواب بہادر یار جنگ کی ہمیشہ قدر کی ان کی تقاریر، انکے جذبۂ حب الوطنی اور ملتِ اسلامیہ کے تعلق سے ان کی خدمات کو سراہا۔ یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ مجلسِ اتحاد المسلمین کو حکومت کیجانب سے مالی امداد بھی ملا کرتی تھی۔

کچھ عرصہ کے لئے نواب صاحب اور اعلیٰحضرت کے درمیان اختلاف رہا اور اس کی وجہ اغیار کی سازشیں اور پروپیگنڈہ تھا۔ لیکن بہت جلد ان مکروہ سازشوں کا پردہ چاک ہوگیا اور دونوں کے درمیان خلوص و عقیدت کے مستحسن جذبات ترقی پاتے رہے۔

زبان بندی کے دوران جب بھی مسلم لیگ کو بہادر یار جنگؒ کی خدمات درکار ہوئیں اور قائدِ اعظم محمدؐ علی جناح نے اعلیٰحضرت سے نواب صاحب کو تقاریر کرنے کی اجازت طلب کی اعلیٰحضرت نے فوراً اجازت دیدی۔

اعلیٰحضرت خسرو دکن کو نواب بہادر یار جنگ رح سے جو خلوص و محبت تھی اس کے ثبوت کے لئے چند مثالیں کافی ہوں گی:۔

حیدرآباد دکن میں وکٹری پلے گراؤنڈ پر سیرۃ النبی صلعم کی سالانہ محفل ہوا کرتی تھی۔ جس میں ہندوستان سے مشہور مقرر بھی مدعو کئے جاتے تھے۔ حضور نظام اس سالانہ جلسے میں شرکت فرماتے تھے۔ ۱۹۲۸ء میں نواب بہادر یار جنگؒ کی اس جلسے میں پہلی تقریر تھی۔ اس وقت نواب صاحب

کی عمر ۲۳ برس کی تھی۔ نواب صاحب "سرورِ کونین کے طرزِ حکمرانی" پر تقریر فرما رہے تھے۔ دورانِ تقریر حضور نظام تشریف لے آئے۔ نواب صاحب مرحوم نے جیسے ہی شہر یارِ دکن کو دیکھا تو اپنے موضوع کو وہیں سے پلٹا اور ان سے مخاطب ہو کر فرمایا:-

"محمد عربی کے اے تخت نشین و تاج پوش غلام آ، میں
تجھے بتاؤں کہ اس شہنشاہ کونین کی نظر میں اندازِ ملوکیت
کیا تھے"

لوگ دم بخود تھے کہ مطلق العنان حاکمِ وقت سے یہ اندازِ تخاطب نظام کے عتاب کا باعث ہوگا۔ نواب صاحب سوا گھنٹے تک سیرتِ طیبہ پر بولتے رہے۔ لب ولہجہ کا سوز وگداز اور اندازِ بیان کی دلنشینی کا یہ عالم تھا کہ حضور نظام کے آنسو رواں ہو گئے وہ بار بار اپنے زانو پر ہاتھ مارتے تھے۔ اور فقروں کو بار بار دھرانے کی فرمائش کرتے۔ جلسے کے اختتام پر نواب صاحب نے انھیں سلام کیا۔ حضور نظام پر تقریر کا جادو کام کر چکا تھا وہ مُہر بہ لب تھے۔ کچھ دیر بعد مُہرِ سکوت ٹوٹی۔ نواب صاحب پر تحسین آفرین کے پھول برسنے لگے۔ اُسی رات کو ۱۲ بجے بارگاہِ خسروی سے "بہادر یار جنگ" کا خطاب عطا کیا گیا۔

نواب صاحب کی رحلت پر حضور نظام نے اعترافِ خدمات کا یوں

اظہار فرمایا :-

"یہ بڑا نازک زمانہ ہے اور یہ وقت ان کی خدمت کا تھا، جو کام انہوں نے قوم و مذہب کے لئے انجام دیئے وہ ان کو ہمیشہ زندہ رکھیں گے۔ اِنسان کی قدر مرنے کے بعد ہوتی ہے ان کا بدل نہیں مل سکتا۔ سینکڑوں برس صبح و شام کی گردشوں کے بعد دنیا ایسا آدمی پیدا کرتی ہے جو اپنی صِفات اور خدمات کی وجہ سے قوم میں ہر دل عزیز ہو جاتا ہے" (اخبار تنظیم قائد ملت نمبر ۱۳۶۳ھ)

حضور نظام نے نواب صاحب کی رحلت پر مادہ تاریخ رحلت کے ذریعہ وفاشعاری کی ایک اور مُہر ثبت کی :-

گرفتہ بخششے از دست قادر | برائے حفظِ حق قوم نادر
بگفتہ کار اور در گوشِ عثمان | بہادر بود و خود در جنگ ماہر
۱۳۶۳ھ

نوٹ :- ہر چہ خدماتِ بے لوثانہ برائے قوم و ملت خویش انجام دادہ بود ضرور قابلِ ستائش دہیم ایں امر بہ تشکل یادگار اور در قلوب آنہا خواہد ماند بہ تشکر و امتنان علاوہ موروثی جان نثاری ملک و مالک خدا راؤ را غریقِ رحمت بکناد"

# دکن اور مہاجرین

۱۵ راگست ۱۹۴۷ء کے دن غلامی کی زنجیریں کٹ گئیں۔ قفس کی تیلیاں ایک ایک کر کے ٹوٹتی چلی گئیں مسلمانوں کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوا۔ ہندوؤں نے اکھنڈ بھارت کا جو، خیالی شیش محل بنایا تھا جب وہ چکنا چور ہو گیا تو انھوں نے مسلمانوں سے اس کا انتقام لیا۔ ہندوستان کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک فسادات کی آگ بھڑک اٹھی۔ خون کی ہولی کھیلی جانے لگی۔ ہر طرف خون ہی خون بہنے لگا۔ بابر واکبر، گوتم و نانک کی سرزمین میں لوٹ سی پڑ رہی تھی۔ ہر طرف لاشے ہی لاشے، لٹی ہوئی جوانیاں اور لٹے ہوئے قافلے نظر آنے لگے۔

جنوبی ہند میں صرف دکن کی ایک ریاست ایسی تھی جہاں امن و امان تھا، جو لٹے ہوئے مسلمانوں کی امیدوں کا مرکز تھی۔ لٹے ہوئے قافلے دکن کی جانب کوچ کرنے لگے۔ دکن نے ان کے لئے اپنا آغوش کر وا دیا ان کو اپنی باہوں میں بھینچ لیا، انھیں اپنے سینے سے لگا لیا۔ بے سروسامان قافلوں کو پناہ دی دکن کے مسلمانوں نے اپنے مسلمان بھائیوں کے لئے اپنے در کھول دے، انھیں سر آنکھوں پر بٹھایا۔ دکن کے ہر مسلمان

نے چودہ سو سال پہلے کے انصاریوں کی روایت کو زندہ کردیا۔

جوں ہی کسی قافلے کی آمد کی خبر ہوتی مسلمان جوق در جوق ان کے استقبال کے لئے اپنے گھروں سے نکل آتے۔ کسی کے ہاتھوں میں کھانے پینے کا سامان ہوتا، کسی کے پاس میوؤں کی ٹوکری ہوتی، کوئی بستر لئے چلا آتا، کسی کے پاس کپڑے ہوتے اور جس کے پاس کچھ بھی نہیں ہوتا تھا تو وہ اپنی آنکھوں میں پیار لئے، دل میں درد لئے، کسی یتیم یا کسی بوڑھے کی خدمت کا جذبہ لئے چلے آتا۔ چادروں میں لپٹی ہوئی عورتیں اپنی ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کے لئے چادریں اور اوڑھنیاں لے آتیں۔

حکومتِ حیدرآباد نے ان مہاجرین کے لئے کیمپ قائم کردیئے۔ اپنے خزانے کے منہ کھول دیئے۔ ان کی آبادکاری کے لئے لاکھوں روپئے منظور کئے۔ شہر کے مختلف علاقوں میں ان کے بسانے کے انتظامات کئے اور اتنی تیزی کے ساتھ کہ وہم وگمان بھی نہیں کیا جاسکتا۔ مزید مہاجرین کو بحفاظت تمام دکن لانے کے لئے اسپیشل ٹرینیں چلائی گئیں۔ جیسے ہی کوئی قافلہ دکن پہنچتا رضاکاران مہاجرین کو پناہ گزین کیمپ میں پہنچادیتے جہاں سرکاری طور پر صبح وشام کھانا تقسیم کیا جاتا تھا۔ ان کیمپوں میں دوا خانے قائم کئے گئے۔ راشن کی دوکانیں کھولی گئیں۔ مہاجرین کے راشن کارڈ بنائے گئے اور قلیل عرصے میں ان کے لئے پکے کوارٹر بنادیے گئے۔ دفترِ

روزگار کھول دیا گیا۔ حکومت نے مہاجرین پر ملازمتوں کے دروازے کھولدیئے ہر شخص کو اس کی قابلیت، اہلیت اور صلاحیت کے مطابق روزگار فراہم کیا گیا اور قلیل عرصہ میں انھیں فکر معاش سے آزاد کر دیا۔

دکن کے باشندوں نے ان مہاجرین کی خدمت کی سعادت حاصل کی۔ ہر گھر سے صبح و شام مہاجرین کیمپ میں کھانا پکوا کر بھجوایا جاتا تھا، کپڑے بھجوائے جاتے تھے پناہ گزین کیمپوں میں ہر طرف رونق ہی رونق رہا کرتی تھی۔ رضا کار شب و روز ان کی خدمت میں مصروف رہتے۔ مہاجرین کی امداد کے لئے فنڈز جمع کئے گئے۔ جو لوگ دن بھر اپنی ملازمت کے باعث مہاجرین کی خدمت نہیں کر سکتے تھے وہ شام کے وقت پناہ گزینوں کے کیمپ میں آ جاتے اور ممکنہ خدمت انجام دیتے تھے۔

انتہائی قلیل عرصے میں دس لاکھ مہاجرین مہاجر نہیں رہے بلکہ دکن کی آبادی کا جزو لاینفک بن گئے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ مسلمانوں نے اپنا حق ادا کر دیا۔ مہاجرین اپنا دکھ درد بھول گئے۔ ان کی بگڑی ہوئی قسمتیں سنور گئیں اور انہوں نے اپنی لٹی ہوئی جنت کو پھر سے آباد کر لیا۔

ے مسلماں کے لہو میں ہے سلیقہ دلنوازی کا
مروت حسنِ عالمگیر ہے مردانِ غازی کا

---

# ایک انجمن جو لٹ گئی

اے دکن تجھ کو یاد کر کے زمانہ بہت روئے گا

تو ایک تاریخ ہے جسکا ہر باب روشن اور درخشاں ہے، تجھ سے علم و ادب، تہذیب و تمدن عظمت و رفعت شوکت اور حشمت کی ایک داستان وابستہ ہے. تو نے مسلمانوں کو اس وقت سہارا دیا جب وہ بے سہارا تھے ۔ جب بھی مسلمانوں پر مصائب و آلام نے یورش کی تو تیرے دَر انکے لئے وَا ہو گئے. تو نے کتنے گریبانوں کے چاک رفو کئے. کتنے ہی پیاسوں کی ساقی گری کی۔ کتنوں نے تجھ سے فہم و فراست اور دانائی کی روشنی حاصل کی. تو نے لٹے ہوئے قافلوں کو پناہ دی، ڈوبتے ہوئے سفینوں کی ناخدائی کی.

اے دکن. کتنی دلکش تھی تیری سرزمیں:۔

تیری زمین سرتاسر رشک سطح چرخ مینائی تھی. تیرا ہر گوشہ دامانِ باغباں و کفِ گل فروش تھا۔ کبھی تیرے مرغزاروں میں

طوطیوں، عندلیبوں اور قمریوں کے ہوش ربا نغمے گونجا کرتے تھے، تیری ہر گلی رشکِ خلدِ بریں اور ہر کوچہ کُنجِ بہشت تھا. تیری فضائیں کتنی پُر نور تیری صبحیں کتنی دلنواز اور تیری شامیں کتنی نظر نواز ہوا کرتی تھیں، تیری برساتیں، تیری بہاریں، تیرے روز و شب اور تیری محفلیں یاد آتی ہیں، تو دل میں ایک ہوک سی اٹھتی ہے، دل بھرّا جاتا ہے اور آنکھیں اشکبار ہو جاتی ہیں. آنسو تیری یادوں کا صِلہ بن جاتے ہیں۔

کتنے پیارے ہیں تیرے مکیں

خلوص و وفا کے پیکر، علم و ادب کے عاشق، تمدّن کے امین، تہذیب کے علمبردار، اسلامی روایات کے شیدائی، شائستگی کے مجسّمے، علم نواز، عالم نواز، مہمان نواز۔ آن پر جان دینے والے بگڑیں تو سراپا آتش فشاں ـــ غم گسار ایسے کہ موم کی طرح پگھل جائیں، رواداری کا بے مثال مرقع ـــ جنہیں بزم آرائی کا سلیقہ بھی ہے اور رزم آرائی کا بھی ـــ جو مشرق و مغرب کی روایات کا حسین امتزاج بھی ہیں۔

# ایک سوگوار صبح

۲۸ر ستمبر ۱۹۴۸ء کی صبح دکن کی ایک سوگوار صبح تھی۔ یہ صبح صبح نہیں تھی بلکہ اسلامی اقتدار تہذیب و تمدن، علم و ادب اور ۲۰۰ سالہ اسلامی روایات کی شام تھی۔

اس روز ایسی ریاست کا آفتاب غروب ہوگیا جو ہندوستان میں اسلامی اقتدار کا واحد مظہر بھی ریاستِ دکن مسلمانوں کی امیدوں کا ملجا اور ماوٰی تھی، ثقافت اور تمدن کا گہوارہ تھی، یہ دانشوروں کی سرزمین تھی، علما و فقہا کا مسکن تھی اور اولیا اللہ کے رُشد و ہدایت کا مرکز تھی، یہاں دولت بھی تھی حکومت بھی تھی، شان و شوکت اور رعب و دبدبہ بھی تھا۔

الغرض دکن ایک دبستان تھا، ایک انجمن تھی۔ اس کے گلشن میں اس وقت خزاں آئی جب علم و فن پر بہار آئی ہوئی تھی۔ دکن کیا لٹا دربارِ اکبری لُٹ گیا۔

دکن کی وسیع و عریض مملکت کے چپہ چپہ پر عظمتِ رفتہ کے نشان ملتے ہیں۔ اس کے ماتھے پر تاریخ کے نقوش ثبت ہیں۔ دکن کے اپنے دریا تھے، اپنے سبزہ زار تھے، اپنے جنگل تھے، اپنی فوج تھی، اپنا سکہ تھا، اپنا مالیہ تھا، اپنی ریلوے تھی، اپنی پولیس تھی، اپنی صنعتیں تھیں، اپنی عدالتیں تھیں، اپنی نشرگاہ تھی۔ ڈاک، تار، ٹیلی فون اور ریلوے پولیس غرضکہ سب کچھ اس کا اپنا تھا۔

# سنہ ۱۹۴۸ء کے بعد

سنہ ۱۹۴۸ء کے بعد آصفجاہی خاندان کی ڈھائی سو سالہ بادشاہت ختم ہو گئی، شہر یارِ دکن اب شہر یار نہیں رہے تھے۔ بلکہ شہر یاری کی ایک یادگار بن کر رہ گئے تھے۔ وہ بادشاہ نہ ہوتے ہوئے بھی سنہ ۱۹۶۷ء تک مسلمانوں کے دلوں پر حکومت کرتے رہے۔ سنہ ۱۹۴۸ء کے بعد جب مسلمان مصائب و آلام کا شکار ہو کر بے یار و مددگار ہو گئے اور حضور نظام ایک عام شہری کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو گئے تو ان کو اپنی حالت کا تو نہیں بلکہ مسلمانوں کے دکھ درد کا بے حد خیال رہا۔ ان کو اپنی حالت پر اس لئے افسوس نہیں ہوا کہ انہوں نے بادشاہ ہونے کے باوجود ایک عام شہری، ایک غریب اور قلندر کی زندگی گزاری تھی لیکن ان کو مسلمانوں کا بے حد خیال تھا جنہوں نے فارغ البالی اور خوشحالی کی زندگی گزاری تھی۔ حضور نظام کی دولت پر غاصبوں نے قبضہ کر لیا۔ اب حضور نظام دنیا کے امیر ترین بادشاہ نہیں رہے تھے۔ وہ اس اعتبار سے امیر رہے کہ ان کے پاس قناعت، توکل اور استغناء کی دولت تھی۔ انہوں نے اپنی زمینات فروخت کر دیں اور جو دولت ان کے پاس رہ گئی تھی اس کو انہوں نے مسلمانوں کیلئے وقف

کر دیا۔ بادشاہت کے دور میں بھی ان کی دولت ان کی رعایا کے کام آئی اور غریبی میں بھی انہوں نے رعایا کی خدمت کی۔ اپنی اولاد، اپنے لواحقین کے لئے لاکھوں روپے کے ٹرسٹ بنا دئے۔ مسلمان بچوں کی تعلیم کے لئے لاکھوں روپئے کا "نظام ایجوکیشنل ٹرسٹ" بنایا۔ بیواؤں اور یتیموں کی امداد میں کوئی کمی نہیں ہوئی بلکہ اس میں اضافہ کر دیا۔ باوجود اس کے کہ وہ دولتمند نہیں رہے تھے لیکن انہوں نے اخراجات میں کمی کی خاطر اپنے ملازمین کے عملے میں کوئی تخفیف نہیں کی۔

جب حکومت ہند نے ان کے وظیفہ میں کمی کر دی تو دین یار جنگ معتمدِ پیشی نے تجویز پیش کی کہ چونکہ وظیفہ میں کمی ہوگئی ہے اس لئے ان ملازمین کو علٰحدہ کر دیا جائے جن کے ذمے ایسے کام ہیں جن کی اب ضرورت باقی نہیں رہی۔ حیدرآباد میں برقی روشنی سے پہلے سڑکوں پر قندیلیں جلائی جاتی تھیں چنانچہ کنگ کوٹھی میں بھی قندیلیں روشن کی جاتی تھیں۔ برقی روشنی کے آنے کے بعد بھی ان ملازمین کو برطرف نہیں کیا گیا اور برسہا برس سے انہیں تنخواہیں دی جاتی تھیں۔ دین یار جنگ نے جب یہ تجویز پیش کی تو حضور نے فرمایا کہ اس میں شک نہیں کہ آج کے برقی روشنی کے دور میں ان کی ضرورت باقی نہیں رہی لیکن میں نہیں چاہتا کہ ان کو نکال دیا جائے اور یہ در بدر فقیروں کی طرح بھیک مانگتے پھریں۔ ان کے ساتھ

ان کے لواحقین بھی ہیں۔

حضور نظام نے ان شرفاء کی اولاد کے لئے ایک ٹرسٹ بنایا جو نیرنگیٔ زمانہ کے شکار ہو گئے تھے اور جن کی معاشی حالت اس قابل نہیں رہی تھی کہ اپنی اولاد کو تعلیم دلوا سکیں۔ چنانچہ ایسے بے یار و مددگار لڑکوں اور لڑکیوں کو حضور نظام نے اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا۔ ان میں باہمی رشتے قائم کئے اور ان کی شادی بیاہ کے اخراجات ادا کئے۔ ان کے لئے مکان بنوا دیئے جن میں زندگی کی ساری ضروریات کا سامان فراہم کیا گیا ہے۔ ان کے خورد و نوش کے اخراجات ٹرسٹ برداشت کرتا ہے اور ان کے جیب خرچ کیلئے معقول رقم دی جاتی ہے۔ ایسے تمام لڑکے "خانہ زاد" کہلائے جاتے ہیں۔ ان کی تعلیم و تربیت کے لئے معقول رقم خرچ کی جاتی ہے اور بہترین اساتذہ کے ذریعہ تعلیم دلوائی جاتی ہے۔

# اور شمع بجھ گئی

فروری ۱۹۶۷ء میں مغلیہ تہذیب و ثقافت کی آخری شمع ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگئی، حضور نظام کی موت ایک بادشاہ کی موت نہیں ہے بلکہ ایک سچے مسلمان، ایک قلندر اور ایک حاتم کی موت ہے۔

حضور نظام مغلیہ سلطنت کی آخری یادگار تھے۔ ان کے ساتھ ہی ایک تاریخ ختم ہوگئی ایک دبستان ختم ہوگیا، ایک انجمن لٹ گئی اور ایک درخشاں عہد مٹ گیا۔

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

# آخری جلوس شاہانہ

فروری ۱۹۶۷ء میں اعلیحضرت علیل ہوئے۔ ان کی علالت کی خبر دکن سے یورپی ممالک تک جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ دکن میں روزانہ سینکڑوں لوگ اعلیحضرت کی کنگ کوٹھی پر جمع ہوتے اور ان کی صحت کے خبرنامے کا انتظار کرتے ڈاکٹروں کی متفقہ رائے تھی کہ اعلیحضرت کو خون دیا جائے لیکن اعلیحضرت نے خون لینے سے انکار کر دیا۔ ... اللہ اکبر۔

اسی زمانہ میں ہندوستان میں کانگریس کے انتخابات ہو رہے تھے بڑے بڑے چوراہوں پر NEON SIGNS کے ذریعہ انتخابات کے نتائج سے عوام کو باخبر رکھا جا رہا تھا۔ انتقال کے ایک روز قبل یہ افواہ پھیل گئی کہ اعلیحضرت انتقال فرما گئے۔ یہ افواہ سنتے ہی بلاتخصیص مذہب و ملت لوگوں نے اپنی دوکانیں بند کر دیں۔ بعد میں پتہ چلا کہ خبر غلط تھی لوگوں نے دوبارہ کاروبار شروع کر دیا۔ اُس دن تین بار ایسی افواہیں پھیلائی گئیں اور تین مرتبہ دوکانیں بند کی گئیں۔ انتقال کے روز جب لوگوں کو اخبار کے ضمیمہ کے ذریعہ لوگوں تک انتقال کی خبر پہنچی تو سارے شہر کے بازار بند ہو گئے۔ لوگ جوق درجوق بلاتخصیص مذہب و ملت کنگ کوٹھی کی جانب روانہ ہو گئے۔ لوگوں کا

ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر کنگ کوٹھی کے اطراف وجوانب پھیل گیا تھا۔ پرانے وقتوں کے وہ لوگ جو اعلیٰحضرت کے دورِ حکمرانی کو دیکھ چکے تھے فرطِ غم سے زار و قطار رو رہے تھے اور جشنِ تاجپوشی اور جشنِ سیمیں کے واقعات ایک دوسرے سے بیان کر رہے تھے۔

اعلیٰحضرت کے آخری دیدار کے لئے لوگ گھنٹوں پہلے سے کنگ کوٹھی پہنچ چکے تھے۔ کنگ کوٹھی کی سمت جانے والی تمام سڑکوں پر دور دور تک انسانی سروں کے علاوہ کچھ نظر نہ آتا تھا۔ زیادہ سے زیادہ مشتاقانِ دید کی سیرابی کے لئے گلیوں میں دو دو آدمیوں کی قطاریں تھیں اور بڑی سڑکوں پر چار چار آدمیوں کی قطاریں تھیں۔ سوگواروں کا ہجوم منظم تھا اور ان کی آنکھیں اشکبار ہو رہی تھیں۔

کنگ کوٹھی کے عقب والی سڑک صرف عمائدین۔ عہدہ داران اور شاہی خاندان کے افراد کے لئے مخصوص کر دی گئی تھی۔ برادرم احمد قدوائی صاحب ان خوش نصیبوں میں سے تھے جنہوں نے اعلیٰحضرت کو ان کی خوابگاہ میں حشر تک نہ جگانے والی نیند میں دیکھا۔ احمد قدوائی صاحب اور ان کی اہلیہ لیڈی ڈاکٹر صالحہ بانو قدوائی جب خوابگاہ میں داخل ہوئے تو انہوں نے شاہی خاندان کے افراد کو زار و قطار روتے ہوئے دیکھا۔ خوابگاہ میں ایک معمولی سا پلنگ تھا جس پر پتلی سی توشک تھی ایک تکیہ اور چادر تھی۔ فرش پر ایک بادشاہ

اپنے پہلو میں تاریخ کی عظیم داستان لئے محو خواب تھا۔ چہرے پر وہی کرّوفر اور وہی جلال و جمال تھا جو اکاسی برس تک ان کے ہمراہ تھا۔ آخری وقت بھی ہمرکاب تھا۔

اعلیٰحضرت بندگانِ عالی کا آخری جلوس کنگ کوٹھی سے روانہ ہوا۔ اس مرتبہ حضور پُرنور کو لوگ اپنے کندھوں پر اٹھائے ہوئے تھے۔ آخری سواری مکہ مسجد کی جانب روانہ ہوئی اور اِس شان سے کہ ساڑھے پانچ سے لے کر چھ لاکھ تک عقیدتمند اس جِلو میں مودب، خاموش اور بادیدۂ نم آخری خراجِ عقیدت پیش کر رہے تھے۔ کئی میل لمبی سڑک پر ہزاروں پرستار اشکوں اور آہوں کے ہار لئے اپنے محبوب بادشاہ کا انتظار کر رہے تھے۔ عجیب بات تھی کہ جو سواری برسہابرس تک پلک جھپکنے میں گزر جایا کرتی تھی۔ منٹوں کا سفر گھنٹوں میں طے کر رہی تھی ساڑھے پانچ سے لے کر چھ لاکھ کے انسانی سمندر کو دیکھ کر ایک مقامی باشندے مسٹر نٹ راج نے کہا۔ "اس ملک میں جمہوریت کیسے کامیاب ہو سکتی ہے۔ جبکہ اقتدارِ شاہانہ کے خاتمہ کے بیس سال بعد بھی اپنے بادشاہ سے عقیدت کا یہ عالم ہو"

اعلیٰحضرت بندگانعالی کو ان کی والدہ مرحومہ کے پہلو میں جگہ دی گئی اس لئے کہ اعلیٰحضرت کی وصیت تھی کہ۔

"مجھے اپنی والدہ کے پہلو میں سپرد خاک کیا جائے۔
میں مکّہ مسجد میں اس لئے دفن نہیں ہونا چاہتا کہ وہاں
سلاطینِ آصفیہ محوِ خواب ہیں اور میں بادشاہ نہیں
بلکہ فقیر تھا"

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے۔

---

# نگری نگری دوارے

(شعری مجموعہ)

از

جواں سال و جواں فکر شاعر

## عزیز اقبال

زیر طبع

رائٹرز بیورو

۲۰- ہیمانی مینشن - بندر روڈ - کراچی

فون : ۲۳۸۷۳۳